ہمایوں

سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء

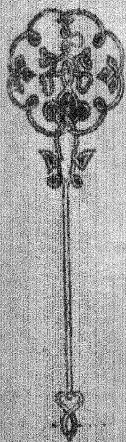
بیادگار عدیم المثال فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

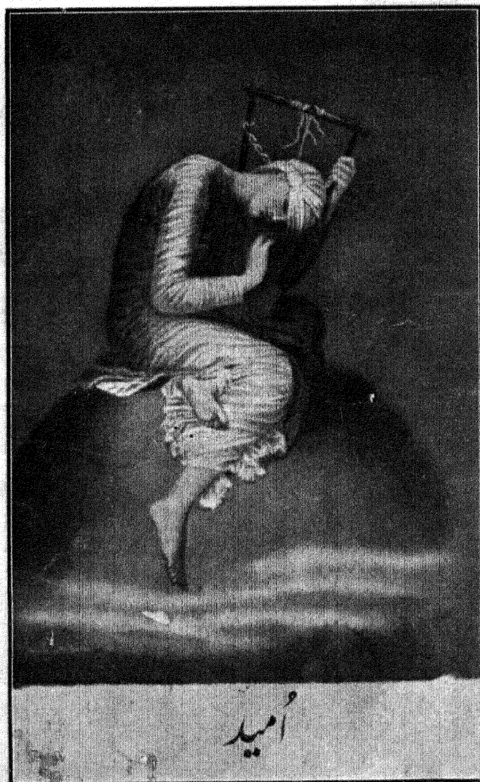
اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر۔ بشیر احمد۔ بی۔ اے (آکسن)

بیرسٹر ایٹ لا

جائنٹ ایڈیٹر۔ حامد علی خاں





اُمید

جلد (۳۱)
نمبر (۱)

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ جنوری ۱۹۳۷ء

سالگرہ نمبر
۱۹۳۷ء

تصاویر: ۱- انسانی برادری (رنگین)، ۲- سیاہی و سفیدی ۳- راج ہنس ۴- دو بچے ۵ و ۶- کھلے بال ۷- ہوائی کرتب ؛

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	کلامِ ہمایوں (نظم)	آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین ہمایوں مرحوم	۳
۲	بزمِ "ہمایوں"	بشیر احمد	۴
۳	جہاں نما	"	۱۴
۴	سرمایہ داری (نظم)	حامد علی خاں	۲۴
۵	تجزیۂ نفس	بشیر احمد	۲۵
۶	آوازِ شاعر (نظم)	حضرتِ جوش ملیح آبادی	۳۹
۷	الوداع اے شیخ سعدی الوداع	"فلک پیما"	۴۱
۸	بڑے آدمی (نظم)	علامہ برجموہن دتاتریا کیفی دہلوی صدرِ انجمنِ اُردو پنجاب	۴۶
۹	مکالمۂ جسم و جاں (نظم)	حضرتِ امجد حیدر آبادی	۴۷
۱۰	جہلم میں ناؤ پر	جناب کرشن چندر صاحب ایم۔اے	۴۸
۱۱	جل کی ترنگ (نظم)	"میرا جی"	۵۶

قیمت فی پرچہ بارہ آنے

نمبر	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱۲	زہرہ کا عشق (افسانہ)	جناب پروفیسر سید فیاض محمود صاحب ایم۔اے	۵۷
۱۳	جامِ زندگی (نظم)	جناب پروفیسر محمد اکبر صاحب مُنیر ایم۔اے	۶۸
۱۴	م۔ک۔ن۔ب	جناب گیان چند صاحب طالب ایم۔اے	۷۰
۱۵	غزل	حضرت شبیہ زیدی حیدرآبادی	۷۳
۱۶	"	جناب ملک مراتب علی خاں صاحب تائب	۷۴
۱۷	اُلٹ پھیر (افسانہ)	محترمہ ہیم لتا دیوی اشٹھانہ	۷۵
۱۸	انتہائے کرم (نظم)	جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی	۸۳
۱۹	رشحات (متفرق اشعار)	جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری	۸۴
۲۰	رادھا کے گیت	حضرت عظیم قریشی لدھیانوی	۸۵
۲۱	معارف	حضرت ابنِ حزیں	۸۶
۲۲	نا پختہ پورے (ڈراما)	حامد علی خاں	۸۷
۲۳	غزل	حضرت نشتر جالندھری	۹۳
۲۴	تحدیدِ اسلحہ	جناب سعادت حسن صاحب منٹو مدیر "مصوّر" بمبئی	۹۴
۲۵	غالب اور حالی کے اشعار پر دو پُرلطف تضمینیں	جناب عبدالرشید صاحب راحل ہوشیارپوری	۹۵
۲۶	نغمۂ شوق (غزل)	حضرت حفیظ ہوشیارپوری ایم۔اے	۹۶
۲۷	ملکی شکوہ (نظم)	ب۔ا	۹۷
۲۸	محفلِ ادب		۹۹
۲۹	مطبوعات		۱۰۳

چندہ سالانہ ۵ؔ مع محصول، ششماہی ۳ؔ، قیمت سالگرہ نمبر ۱۲ؔ

شاعرانِ قوم سے

اے شاعرانِ قوم! زمانہ بدل گیا
پرمثلِ زلفِ یار تمہارا نہ بل گیا!

پیٹو گے کب تلک سرِ رہ تم لکیر کو
بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا

دیوانہ وار بیٹھے ہو سینوں پہ رکھ کے ہاتھ
یہ کس کا ہاتھ سب کے دلوں کو مسل گیا؟

آخر ہر ایک دل کو ہے اُلفت سے کچھ لگاؤ
کیا اک تمہیں پہ عشق کا جادو ہی چل گیا؟

یہ کیا غضب کہ ڈوب گئے سات آسماں
آنسو تمہاری آنکھ سے گر کر نکل گیا

روشن ہوئے ہیں نورِ بصیرت سے دو جہاں
سوتے ہیں کوئی آنکھوں پہ گر پاؤں مل گیا

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی!
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!!

اِک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح
اِک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا

ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے
گر گر کے ملکِ ہند کچھ آخر سنبھل گیا!

دن گزرا پر تمہاری وہی ایک بات ہے!
سر پر کھڑی وہ دیکھو قیامت کی رات ہے!

حضرت [illegible]



بزمِ ہمایوں

بزمِ ہمایوں کچھ عرصے سے بزمِ اردو بن چکی ہے۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ اردو کے عالیشان محل میں ہمایوں تو صرف ایک ذرا سا کمرہ ہے۔ پچھلے سال ایک نیم سیاسی زلزلہ آیا جس نے اس عظیم الشان محل کو کچھ ہلا دیا سو لازم تھا کہ اس کے سارے مکین اس غیر معمولی واقعے سے متاثر ہوں۔ ہمارے بدبخت ملک میں زلزلے تو آتے ہی ہیں۔ آتے ہی رہیں گے۔ انہیں کون روک سکتا ہے؟ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ مکان جس میں ہم رہتے ہیں۔ جس کی عظمت اور خوبصورتی کے ہم دلدادہ ہیں۔ اس کی بنیادوں کا کیا حال ہے۔ ہم انہیں کس طرح مضبوط کر سکتے ہیں۔ ہم کس طرح اور کس حد تک ان کی تجدید کر سکتے ہیں؟ اس کے ایوانوں اور کمروں اور برآمدوں اور شہ نشینوں کی صفائی اور خوبصورتی میں کیسے اضافہ کر سکتے ہیں۔ کہ نہ صرف ہم بلکہ ہمارے ہمسائے اور ہماری اور ان کی آنے والی نسلیں اس کی مضبوطی اور دلکشی سے متاثر ہوں اور اس پر بجا طور سے فخر کر سکیں؛

---

۲۴ اور ۲۵ اپریل کو ناگپور میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا وہ اجلاس منعقد ہوا جس میں مہاتما گاندھی نے "ہندی اتھوا ہندوستانی" کی ہوائی اڑائی۔ بظاہر اس پرشد کا مقصد یہ تھا۔ کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادبوں اور ادیبوں میں میل پیدا کیا جائے۔ اور اس طرح ان کو ترقی کی راہ پر لگایا جائے۔ لیکن پرشد کی زبان کو "ہندی اتھوا ہندوستانی" قرار دے کر گاندھی جی نے اپنے "حقیقی" چھپے ہوئے مطلب کو ظاہر کر دیا۔ یہ مطلب محض ہندی کو "راشٹر بھاشا" (ملکی زبان) بنانا ہے۔ جیسا کہ "ہنس" اکتوبر ۳۵ء کے نمبر میں منشی پریم چند ایڈیٹر رسالہ نے صاف طور پر بتا دیا۔ اردو کے مجاہد اعظم مولوی عبدالحق صاحب بھی پرشد میں موجود تھے۔ لیکن ان کے شور و غل کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ ادھر ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس بھی ساتھ ساتھ ہو رہا تھا۔ جو ہندی کو قومی زبان بنانے کی مسلسل اور مستقل کوششوں کا ایک جیتا جاگتا مظاہرہ ہے؛

ہندی ساہتیہ سمیلن ۱۹۱۰ء میں قائم ہوئی۔ ان ۲۶ سالوں میں جو کام اس کے ذریعے سے ہوا اس کا کچھ اندازہ ان چند امور سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سمیلن نے ۲۵۰ جگہوں میں ہندی کے امتحانوں کے مرکز کھول دیئے ہیں۔ ان امتحانات کے سولہ شعبے ہیں، چالیس ہزار روپے کے سرمائے سے بہترین تصنیف کے لئے بارہ سو روپیہ کا (گویا نوبل پرائیز کا سا) انعام دیا

جاتا ہے۔ نیز بہترین مصنفہ کو پانچ سو روپیہ ملتا ہے۔ ہندی میوزیم کے لئے الہ آباد میں ۲۶ ہزار روپے کی ایک عمارت تعمیر ہو چکی ہے
سمیلن کا کام پانچ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور ان میں امتحان کمیٹی، ادبی کمیٹی، پرچار کمیٹی، انتظامی کمیٹی، مالیات کمیٹی اپنا اپنا کام
کر رہی ہیں۔ سمیلن کا سرمایہ اس وقت ایک لاکھ روپے سے زاید ہے۔ سمیلن سے ملحقہ ستر آزاد ادارے ہیں۔ جو سارے ملک
میں کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ دکن میں دکن بھارت ہندی پرچار سبھا نے ۵۴ مرکز کھول رکھے ہیں۔ اور وہاں ہندی پڑھ سکنے
والوں کی موجودہ تعداد کئی لاکھ تک پہنچتی ہے۔ مدراس شہر میں ہندی کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی عمارت بنانے کی تجویز ہو رہی
ہے۔ اس کے ساتھ بمبئی، بڑودہ، گجرات، مہاراشٹر، سی۔ پی، بہار، اڑیسہ، بنگال، آسام، برما، یو۔ پی، پنجاب وغیرہ صوبوں میں بھی ہندی
کی تعلیم و اشاعت کا کام شد و مد سے جاری ہے۔ گاندھی جی ان سرگرمیوں میں نمایاں طور پر حصہ لے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ
انہوں نے ٹنڈن صاحب کو لکھا تھا کہ میرے لئے ہندی کا سوال سوراج کا سوال ہے ۔

بابو راجندر پرشاد سابق صدر کانگرس نے سمیلن کے اجلاس میں ۲۴ اپریل ۳۶ء کو جو خطبہ پڑھا۔ وہ اردو کے حامیوں
کے لئے قابل غور اور سبق آموز ہے۔ یہاں اس اہم خطبے سے جس کا ترجمہ جامعہ میں چھپا ہے چند اقتباسات پیش کئے جاتے
ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جو ہندی آج کتابوں میں لکھی جاتی ہے وہ بہت تھوڑے ہی لوگوں کی مادری زبان ہے .... قومی
زبان ہونے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت ہندی میں آنی اور لانی چاہیئے ..... آج کل کے زمانہ میں جب دنیا میں علمی ترقیوں
کی وجہ سے فاصلہ اور وقت کا فرق اٹھتا جا رہا ہے۔ کوئی بھی زبان دوسری زبان کے اثر سے اپنے کو اچھوتا نہیں رکھ سکتی۔ اگر ایسی
کوشش کرے تو دنیا کی دوڑ میں وہ بہت پیچھے رہ جائے گی..... ہندی بھی اگر جیتی جاگتی زبان ہونا چاہتی ہے تو اسے اپنے
الفاظ کے ذخیرے کو بڑھانا پڑے گا۔ بائیکاٹ کا اصول تو وہ کبھی اختیار نہیں کر سکتی اور نہ بدیسی لفظوں کو باہر رکھ کر وہ اپنی ترقی کر سکتی
ہے۔ ہندی سنسکرت نہیں ہے ..... اس میں ایسے لفظوں کو ہضم کرنے کی طاقت ہونی چاہیئے ..... اس لئے میں ہندی اردو
کے جھگڑے میں فائدہ نہیں دیکھتا ہوں۔ ہندی میں جتنے فارسی اور عربی کے لفظوں کی کھپت ہو سکے گی اتنی ہی وہ وسیع اور مضبوط
زبان ہو سکے گی..... ہم نہ عربی اور فارسی کے لفظوں کا بائیکاٹ کریں گے.. اور نہ سنسکرت کا..... ہمارا مقصد ان دونوں کے بیچ
کا متوسط راستہ ہے..... ہمارے سامنے یہ مشکل سوال ہے کہ ہم نہ تو ان وسطی و جنوبی ہند کے صوبوں کے ہندوؤں کو چھوڑ سکتے
ہیں اور نہ شمالی ہند کے مسلمانوں سے ہندی کو الگ رکھ سکتے ہیں... بہت اچھا ہو اگر ہندوستان کی سب ہی زبانوں میں نئے
(سیاسی اور علمی) لفظ عام طور پر ایک ہی ہوں جیسے کونسلوں کے لئے "دھارا سبھا"، "ویوستھاپکا سبھا"۔۔ لفظوں کا ایک اور خزانہ ہے جس
سے ہم ہندی کی لغت بڑھا سکتے ہیں۔ اور وہ خزانہ گاؤں کی بولی میں رائج لفظوں کا ہے.... میں چاہتا ہوں کہ ہندی کو وسیع اور

"مشترکہ زبان" "قومی زبان" بنانے کے لئے اس کا ذخیرۂ الفاظ بڑھایا جائے اور اس میں فکر اور اندیشہ نہ کرکے جہاں سے ایسے اچھے لفظ مل سکیں جن کا سلیقے سے پرچار ہوسکتا ہو ہم لے لیں تب ہی یہ زبان ہندوستان بھر کی قومی زبان ہونے کا دعوےٰ ثابت کر سکے گی ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اردو صرف فارسی عربی کی طرف ہی اپنی نظر رکھ کر دوسرے لفظوں کا بائیکاٹ کرے گی تو اس کی ترقی کا سوتا سوکھ جائے گا اور وہ محدود زبان بن جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہم مانتے ہیں کہ زبان کی اصلاح کا کام کسی ایک آدمی یا ایک جماعت کے ذریعے سے نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی شکل ہی بدل دی جاسکتی ہے تو بھی اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر کسی زبان کے سبھی مصنف اور عالم اس میں انقلاب لانا چاہیں تو بہت حصوں میں وہ کامیاب بھی ہوسکتے ہیں۔ سبھی زبانوں کی تاریخ میں اس قسم کے زبردست مصنف گذر چکے ہیں جنہوں نے اس زبان کے دھارے کو موڑ کر اس کا روپ بدل دیا ہے ۔ ۔ ۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ ایک چھوٹا لغت ایسے لفظوں کا بنایا جائے جو ہندی اور اردو دونوں کے لفظوں پر حاوی ہو۔ ہم اس چیز کو بھول نہیں سکتے کہ ہندی اور اردو دونوں ہندوستان میں ہیں اور رہیں گی بھی ۔ ایسی حالت میں ہندی جاننے والوں کو معمولی اردو لفظوں کا اور اردو جاننے والوں کو ہندی لفظوں کا علم ہونا ضروری ہے ؛

یہ سوال کہ کیا ہندی اور اُردو ایک ہی زبان ہیں یا ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ؟ کیا ان کو ایک دوسرے کے قریب لایا جاسکتا ہے اور لانا چاہئے ؟ کیا ان میں سے کوئی ہندوستان کی ملکی زبان ہے یا ہوسکتی ہے ؟ یہ سوال گذشتہ سال میں اس قدر پیش پیش رہا ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۳۶ء کے اہم ترین ملکی مسئلوں میں ایک مسئلہ زبان کا درپیش تھا۔ اپنی اپنی زبان کے طرفدار آستینیں چڑھا کر ملکی اکھاڑے میں یوں اتر آئے گویا یہ معاملہ ابھی ادھر یا اُدھر طے ہونے والا ہے گویا یہ ہر زبان کے لئے زندگی اور موت کا معرکہ ہے اور پھر بدقسمتی یہ کہ ہر زبان کو ایک خاص مذہب و ملت کے ساتھ وابستہ کردیا گیا۔ اُردو پر مسلمانوں کا ۔ اور ہندی پر ہندوؤں کا لیبل لگا دیا گیا۔ یہ بالکل بھلا ہی دیا گیا کہ اُردو کے موجودہ دَور کے مصنفین میں سرشار اور چکبست اور سرور اور محروم اور کیفی اور بیسیوں اور ہندو بزرگوں کا شمار ہوتا ہے ۔ بیچارے مسلمانوں سے اور کونسے کام اتنی خوبی اور عمدگی سے سرانجام ہورہے ہیں کہ اب اُردو بھی انہیں کے سر تھوپ دی گئی ۔ کہہ دو ۔ تم جانو تمہاری زبان ۔ ملکی بھائیو ! ذرا غور کرو ۔ اسے تم نے ہم نے دونوں نے مل کر بنایا ۔ ہماری زبان تو فارسی تھی اس میں یہ تھا اور ہے اور ہوگا ۔ اور تم اور ہم اور دیس اور سماج اور سمجھنا بوجھنا اور دیکھنا دکھانا اور مرنا جینا کہاں تھا ۔ یہ ٹھگ بدیا ۔ یہ جیب کترے ۔ یہ من موہن ۔ یہ سہانا سماں یہ اور بیسیوں اور چیزیں ۔ اردو کی قواعد جس کا نام فارسی سہی لیکن جس کی بنیاد کی ساری کی ساری ساخت ہندی بھاشا کی ہے یہ سب بھائیو تمہاری چیزیں تھیں اور اب ہماری تمہاری دونوں کی ہیں ۔ نہ جانے کیوں تم کو غصہ آگیا ؟ وہ جو شاید تمہیں نے سمجھ لیا یا مان لیا کہ ہم میں سے کسی نے کہہ دیا ۔ کہ یہ زبان ہمیں کی

اچھی آتی ہے۔ اس پر تم ایسے بگڑے کہ ہماری اپنی ملی جلی مشترکہ زبان سے تم منہ ہی موڑ بیٹھے۔ ذرا دیکھو تو ذرا سنو تو یہ تم کو اب بھی بڑے پیار اور محبت سے بلا رہی ہے کہ یہی تمہارے دیس کی ہر دلعزیز زبان ہے ؛

یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہندی والے ہندی چھوڑ دیں آخر بنگالی گجراتی ملیالم کنڑی یہ بھی تو ہندوستان کی ہی زبانیں ہیں ان کا ہمارا جھگڑا نہیں تو اُردو کا جھگڑا اک ہندی ہی سے کیوں ہو؟ ہم نہیں کہتے کہ ہندی والے ہندی نہ پڑھیں ہم صرف یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ جو ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پروپگنڈا ہو رہا ہے۔ لاہور تک میں یہ نعرہ بلند کیا جا رہا ہے کہ ہر ہندو مرد عورت اور بچے کو ہندی پڑھنی چاہیئے۔ ہندو وادارے کو اپنا کام اردو چھوڑ کر ہندی میں کرنا چاہیئے آخر اس علیحدگی اور اس بیگانگی کے کیا معنی ہیں ؟ آپ اکثر اُردو پڑھتے تھے۔ اب بھی کچھ نہ کچھ اسے پڑھتے ہی ہیں تو اس کے ساتھ ہندی بھی پڑھیئے۔ آپ کو کون روکتا ہے ؟ آخر یوروپ والے بھی تو دو دو تین تین چار چار زبانیں سیکھتے ہیں کیا آپ اور ہم اک دو زبانیں اور کم از کم دو رسم خط نہیں سیکھ سکتے ؟ یہ کیا ضرور ہے۔ جیسا آپ روز بروز کر رہے ہیں کہ اپنی بیویوں اور بچوں کو اُردو چھڑا کر ہندی سکھائیں۔ اُردو تو آپ پڑھتے ہی آئے ہیں اب جس کسی کو ہندی پڑھنا ہو وہ شوق سے ہندی بھی پڑھے کوئی ممانعت نہیں۔ لیکن یہ مغائرت یہ تفریق یہ ہندو مسلم سوال یہ سب غلط راہیں ہیں جن میں نہ آپ کی ترقی ہے نہ ہماری اور نہ ہمارے غریب ملک کی ؛

اس طوفان بے تمیزی میں شکر ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے تحمل سے کام لیا اور یہ کہہ کر کہ خود ان کی زبان اردو ہے اور یہ سمجھا کر کہ اُردو اور ہندی کو اپنی اپنی جگہ ترقی کرتے رہنا چاہیئے۔ یہ بتایا کہ انڈین نیشنل کانگرس نے ایک عرصہ ہوا یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ ہمارے ملک کی زبان ہندوستانی ہے جو اُردو اور ناگری دونوں حروف میں لکھی جائے گی ؛

لسانی حیثیت سے زبان کے معاملے میں صحیح حالت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اُردو اور ہندی بنیادی طور پر ایک ہی زبان ہیں۔ لیکن اس ایک ہی وسیع بنیاد پر جو دو عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں ان کا بیشتر حصہ علمی و ادبی لحاظ سے مختلف بن رہا ہے۔ یہ حصے اپنی اپنی جگہ ایک حد تک موزوں و مناسب ہیں سو کوئی وجہ نہیں کہ ایک کو بڑھایا اور دوسرے کو گرایا جائے، جسے جس سے دلچسپی ہے وہ اس کے لئے باتیں بنائے کم اور کام کرے زیادہ۔ اور دوسرے کے کام میں رخنہ اندازی نہ کرے اور نہ جان بوجھ کر بنے بنائے رشتے توڑے اور نہ انہوں سے منہ موڑے۔ اُردو ہندی کی مشترک وسیع بنیاد کے بعض حصے یا ابھی خالی پڑے ہیں یا ان پر فقط کچھ جھونپڑیاں سی بنی ہیں۔ لیکن وہاں تا حال کوئی سر بفلک علمی ادبی عمارت نہیں بنائی گئی۔ بعض زندہ دل کارکن یہاں وہ کام کر سکتے ہیں جو ملک و قوم کے لئے ہر طرح مفید ہو۔ خالی زمین۔ یہ شاملات۔ یہ جھونپڑیاں صحیح طور پر ہندوستانی زبان کا مسکن ہیں۔ یہاں نہ عربی

فارسی کے پتھر ہیں۔ نہ سنسکرت کے روڑے۔ عجب نہیں کہ یہ قطعۂ زمین آہستہ آہستہ صاف ہو کر اس قابل بن جائے کہ جو آج اپنے اپنے کوٹھے پر چڑھ کر ایک دوسرے کو گالی گلوچ دے رہے ہیں وہ یہاں آ کر ایک دوسرے کے گلے مل جائیں یعنی زبان اور رسم خط کا مسئلہ عجب نہیں کہ کچھ اور مدت گذر جانے کے بعد خود بخود حل ہو جائے لیکن مستقبل کو کون جان سکتا ہے؟ بہر حال اس وقت ضرورت ایک دوسرے سے رواداری برتنے اور اپنے کام کو باقاعدگی اور استقلال اور اطمینان کے ساتھ سرانجام دینے کی ہے ؛

اُردو ہندی کے کھلم کھلا جھگڑے کا ایک نتیجہ اچھا ضرور نکلا ہے اور وہ ہے اُردو والوں کی بیداری۔ اب تک تو اُردو زبان نے گویا خود کیا جو کیا۔ وہ پیدا ہوئی بڑھی پروان چڑھی، اس نے ناز و ادا سیکھے وہ چنچل بنی ہنسی کھیلی اور ہم بھی اس کے ساتھ کھیلا کئے۔ ہمیں اس سے محبت ضرور تھی اس کے لئے رتجگے ہم نے کئے۔ ضرورت بے ضرورت آہیں ہم نے بھریں آنسو ہم نے بہائے غرض ہم نے الگ الگ اس سے محبت کی۔ لیکن ہم نے کبھی یہ نہ سوچا سمجھا کہ یہ محض ہماری دل لگی کی چیز نہیں۔ بلکہ یہی ہماری تہذیب کی مظہر اور ہماری شائستگی کا آئینہ ہے۔ اور اس جدوجہد کے زمانے میں اس کا تحفظ اور اس کی ترقی فقط ہماری منظم اور متحدہ کوششوں ہی سے ممکن ہے جس کے بغیر ہمارے اس کے لئے محبت کے دعوے سب فضول اور ہمارے لفظی ایثار کے نعرے سب قطعاً بے کار ہیں۔ یہ زمانہ منصوبہ بندی اور جماعت بندی کا ہے۔ اس میں کسی قسم کا محض فطری اور انفرادی عمل اپنا پورا پھل نہیں پاتا آج کل ہر کام میں کتربیونت کانٹ چھانٹ اور دن رات کی سوچ بچار اور دیکھ بھال کی اشد ضرورت ہے۔ اب مقابلے کا زمانہ ہے مجادلہ نہ ہو تو بھی زمانہ ہماری ہر چیز کو پرکھے گا جانچے گا۔ فیصلہ کرے گا کہ کونسی شے کی حیثیت کیسی ہے؟ اگر ہندی کا لکھنا ہندی کا پڑھنا ہندی کا لکھنا ہندی کا چھاپنا اُردو سے بہتر ہو گا، اگر اس کا ادب زیادہ دلکش اور زیادہ زندگی بخش ہوتا جائے گا۔ اگر اس کے ہاں دنیا کی زبانوں کے بہترین ادب کا زیادہ بڑا ذخیرہ جمع ہوتا جائے گا تو اُردو محض اپنے میرو سودا ملکہ غالب و اقبال کے سہارے پر بھی دیر تک زندگی بسر نہ کر سکے گی۔ وقت وقت کی پہچان اور عہد بہ عہد کی ترقی یہ ہے صحیح زندگی افراد کی اور قوموں کی اور ان کی زبانوں کی۔ بغیر اس کے زندگی کا دعوے لایعنی اور قوت کا مظاہرہ محض لچر ہے ؛

یہ نہیں۔ کہ ہم نے زبان کے لئے کچھ کیا نہیں، آخر یہ زبان اپنے بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں کے کئے سے بنی جو بنی۔ ہمارے شاعروں اور مصنفوں نے ایسے وقتوں میں جب قدردان موجود تھے اور ایسے وقتوں میں بھی جب کوئی قدردان نہ تھا اس زبان کی دل سے خدمت کی، اس سے محبت کی، بے اختیار محبت کی وہ اپنے دل کے میلان سے مجبور تھے۔ کہنا چاہیئے کہ وہ اس شیریں زبان کے عاشق زار تھے۔ اسی لئے اس زمانے میں جب بجلی کے قمقمے نہ تھے جب کہ ابھی ریل بھی ملک کے طول و عرض میں نہ پھیلی تھی۔ انہوں نے چراغوں کی روشنی میں پہروں اس کے لئے محنت کی دور دراز کے سفر اختیار کئے

انہیں کے ہاتھوں یہ زبان منجھی اس نے جلا پائی، ہندی اور فارسی کی شیرینیاں اس میں سموئی گئیں اور نرے افراد پر بس نہیں، ادب کے بعض شائقین کی کوشش سے مختلف اداروں نے مختلف اوقات میں بڑے بڑے کام کئے اور کر رہے ہیں۔ گذرے زمانے میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، عربک کالج دہلی، سائنٹیفک سوسائٹی علیگڈھ اور نیٹل کالج لاہور اور حال میں انجمن ترقی اردو، دارالمصنفین جامعہ ملیہ اور وہ شاندار ادارہ جامعہ عثمانیہ اور کئی اور چھوٹے ادارے اور سینکڑوں اخبار اور رسالے اور سینکڑوں افراد جن کے شوق محنت و قابلیت پر اُردو کو ناز ہے یہ سب اپنی محبوب زبان کے لئے وقف رہے۔ سو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُردو والوں نے اُردو کی خدمت نہیں کی، ہمارے انحطاط کے زمانے کا بھی اک کمال تھا جس میں ہماری رہی سہی قوتیں برسر کار آئیں، بجھتی ہوئی شمع کے کچھ شرارے تھے جو ہمارے ادب میں محفوظ رہ گئے۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ آخر ایک تنزل کے زمانے کی یادگاریں ہیں اور بیشتر غم زدہ دلوں کی آہیں اور رنجیدہ لوگوں کی اشکباریاں ہیں ؀

مگر اب زمانے کا طور کچھ اور ہے، ہر طرف ترقی کی پکار اور جرأت و مسرّت کے نعرے ہیں، جدوجہد ہے، مقابلہ ہے، زندگی کی کشاکش ہے اور ہماری حالت بھی وہ نہیں جو تھی، ہم ابھی دوسری قوموں کی طرح بیدار و ہشیار نہ سہی غافل ہیں، مسرف ہیں، وقت کو ضائع کرتے ہیں لیکن کچھ زمانے کی روش سے اور کچھ دوسروں کے طعن و تشنیع اور لکد کوب سے متأثر ہو کر ہم بھی اب اپنے مدتوں کے خواب سے جاگ رہے ہیں، اس لئے اب نرا ہمارا پرانا ادب ہمیں کام نہ دے گا، اب وہ دنیا کی بے ثباتی کے نقشے، وہ معشوق کی پتلی کمر اور صراحی دار گردن کے خاکے، وہ لفاظیاں، وہ رعایتیں وہ بندشیں وہ رسمی طرز نگارش، وہ بے معنی خیال پرستیاں اب بھی اگر ہم ان سے منہ نہ موڑیں گے تو زمانہ انہیں اور ہمیں دونوں کو اپنی ردّی کی ٹوکری میں ڈال کر کہیں کا کہیں پھینک دے گا، مدعا یہ نہیں کہ ہم اپنے ادب کے تمام سانچوں کو توڑ پھوڑ دیں بلکہ یہ کہ اب ہم پرانے ساغروں میں نئی شراب ڈالیں، اور اب ہمارے نرے وہ ساغر ہی کافی نہیں ہیں، ان چند پرانے ساغروں کے ساتھ اب ہم کو سینکڑوں ہزاروں نئے گلاسوں اور کٹوروں کی ضرورت ہے۔ اب ہمیں صرف چند نوابوں اور راجاؤں کی ضیافت طبع کا سامان بہم نہیں پہنچانا بلکہ اس جمہوری اور اشتراکی عہد میں اب ہمیں صلائے عام دینی ہے۔ اب ہمیں عوام کو نکتہ دان بنانا ہے۔ جہالت کو دور کرنا ہے۔ تعلیم کی روشنی پھیلانی ہے۔ اس لئے اب اشد ضرورت ہے کہ ہم تحصیل زبان میں آسانیاں پیدا کریں طباعت و اشاعت کے نئے سہولتیں بہم پہنچائیں، وہ باتیں کہیں اور اس طرح سے کہیں کہ لوگ انہیں بخوبی سمجھ سکیں اور ان سے پوری طرح فائدہ اٹھائیں، وہی علم و ادب صحیح ہے جو زندگی کو صحیح معنوں میں زندہ کرے، جو اسے سلائے، یا رلائے یا جو صرف دل بہلاوا ہی ہو وہ علم نہیں جہل ہے، وہ ادب نہیں سوئے ادب ہے اور بالخصوص ہماری قوم، ہمارا

ملک اور ہمارا یہ زمانہ ان کا تقاضا ہے کہ ہمارا ادب ہماری زندگی کا رہبر بنے، ایک تنزل یافتہ زمانے کا ادب بھی عموماً تنزل یافتہ ہوگا اسی لئے ہمارے ادب کا بیشتر حصہ مردہ ہے لیکن اب زمانے کی اور ہماری حالت کچھ اور ہے اب ہم اپنے رگ و پے میں ایک نئی زندگی کا خون دوڑتا محسوس کرتے ہیں ایسے وقت میں ہمارے مصنفوں اور ادیبوں اور شاعروں کو مقتضائے وقت کے مطابق ترقی اور جدّت پسندی کا نعرہ بلند کرنا چاہیئے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم سب کے سب بم اندازی شروع کردیں یا بزرگوں کا مضحکہ اڑائیں یا گستاخی کو آزادی سمجھ لیں نہیں بلکہ ہم ذلیل کرنے والی خوشامد اور اندھا دھند تقلید اور غلامانہ خاموشی کی بجائے صحیح قدردانی اور عقلمندانہ پیروی اور خوددارانہ گفتگو کا وہ انداز سیکھیں کہ ہم اپنے اور دوسروں کے لئے انقلاب اور تجدید اور حریت کے پیکر بن کر نظر آئیں۔ پھر ہم جو بات کہیں گے وہ دلوں میں جگہ پائے گی، ادیب اگر صحیح معنوں میں ادیب بننا چاہتا ہے تو اسے اپنی زندگی کو ایک عام چلتی پھرتی زندگی بنانا چاہیئے ورنہ اس کا ادب مُردہ یا نیم مردہ اور اس کی بات بے معنی یا کم از کم بے اثر ضرور رہے گی دنیا کی تاریخ میں بارہا ادیبوں نے عظیم الشان قومی ترقیوں کے لئے راہ عمل صاف کی ہے، یہ ہے وہ کام جو آج ہمارے انشا پردازوں کو کرنا چاہیئے۔ یہ کام کٹھن ہے لیکن جو کرنے والا اپنے دل میں اس کے لئے یقین و اعتماد پیدا کرے گا۔ اس کے لئے اس کی تمام مشکلیں یکسر آسان ہو جائیں گی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے گذشتہ سال زبان کے متعلق وہ شورش برپا ہوئی جس کے اثرات ابھی تک قائم ہیں اور نہیں معلوم کب تک قائم رہیں گے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ۱۸۶۷ء میں شاید اس سے بھی پہلے اُردو ہندی کا جھگڑا بہار اور یوپی میں شروع ہوا تھا اُردو ایک مشترکہ زبان تھی ہندی والوں نے اس پر یہ پہلی یورش کی تو سرسید نے اس کی حمایت میں کوشش کی ۱۸۹۷ء میں بھی پھر یوپی میں یہ فتنہ اٹھا۔ پنڈت مالویہ مدتوں ہندی کا پرچار کرتے رہے یہاں تک کہ یوپی میں انہیں خاصی کامیابی حاصل ہوگئی اب پھر گاندھی جی اور کئی دوسرے کانگرسی لیڈروں کی قیادت میں ہندی والے اُردو پر اپنی فوجیں لے کر چڑھ آئے ہیں اب اگر ہم کو اس پر تعجب ہو یا ہم واویلا مچائیں یا ہم انصاف انصاف یا وطن وطن پکاریں تو یہ یا محض ہماری نادانی اور کمزوری کا اظہار ہوگا یا اس سے فقط اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع ہوگا۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی والوں نے درپردہ جو طے کرنا تھا وہ طے کر لیا ہے۔ اور اب موقع پاکر وہ علانیہ طور پر سرگرمی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں اور کرتے جائیں گے۔

ہمیں ان کی اس سرگرمی یا اس مظاہرے سے گھبرانا چاہیئے لیکن اس پر محض ہنس دینا بھی نادانی ہوگی۔ موجودہ ہندی ایک تازہ پیداوار ہے، ایک مصنوعی سی علمی ادبی زبان ہے، اردو کے مقابل میں اس کے بولنے سمجھنے والے کم ہیں لیکن ہندی کی حمایت میں ایک زندہ قوم کا ایک سرگرم گروہ میدان میں اتر آیا ہے، اس کے مقابل میں اُردو کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہیں۔ لیکن اس کی حمایت زیادہ تر ایک ایسی

قوم کے سپرد ہوگئی ہے جو اپنی خواب راحت سے اٹھ کر ابھی اپنی آنکھیں ہی مل رہی ہے۔ وقت نازک ہے مقابلہ سخت ہے معاملہ اہم ہے ہاں جب یہ حال ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم ہنوز غفلت کی نیند سوتے رہیں۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ ہم بیدار ہو گئے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ کام کے متعلق ابھی ہم کچھ زیادہ سوچ ہی رہے ہیں ؛

گذشتہ سال کی شورش کے بعد گذشتہ سال کی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالو تو ظاہر ہو جائے گا کہ اگرچہ اردو والوں نے ہندی والوں کے مقابل میں بہت کم کام کیا ہے لیکن اب وہ بھی کچھ ہاتھ پاؤں مارنے لگے ہیں۔ ۱۲ اپریل کو انجمن حمایت اسلام نے اپنے سالانہ اجلاس کے دوران میں ایک خاص اردو سیشن منعقد کیا جس میں مولوی عبدالحق صاحب کا خطبۂ صدارت اور ایک مدیر ہمایوں کی وہ تقریر پڑھی گئی جو ہمایوں کے اردو نمبر میں شایع ہو چکی ہے ۔ ۱۳ مئی کو راقم کے مکان پر اردو کی انجمن اردوئے پنجاب کا قیام عمل میں آیا اسکے بعد پٹنہ بمبئی جموں وغیرہ میں اردو کی متعدد انجمنیں قایم ہوئیں۔ ۹ اکتوبر کو بہار میں بہار اردو کانفرنس ہوئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مولوی عبدالحق صاحب کی تحریک پر ۲۴ اور ۲۵ اکتوبر کو علیگڈھ میں ایک آل انڈیا کانفرنس کا اجلاس ہوا جس سے ثابت ہو گیا کہ اب ہم میں اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے تحفظ و ترقی کا کچھ احساس پیدا ہو چلا ہے۔ آثار اچھے ہیں اب ہمارا عمل ثابت کرے گا کہ ہمارا مستقبل کیا ہونے والا ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم نہ بے پروائی برتیں نہ تشویش کو دل میں جگہ دیں بلکہ دوراندیش بن کر استقلال اور اطمینان سے نتیجے سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کرتے جائیں ؛

اب کہ حامیان اردو نے انجمن ترقی اردو کو اپنی مرکزی انجمن مان لیا ہے فیصلہ کیا ہے کہ اس کا صدر دفتر دہلی میں منتقل کیا جائے ، اس کی تقریباً پچاس شاخیں ملک کے طول و عرض میں پھیلادی جائیں اس کی چند کمیٹیاں اصلاح زبان کی کمیٹی، علم ادب کی کمیٹی اشاعت خانے کی کمیٹی اور صوبہ واری کمیٹیاں بنائی جائیں ، ایک اشاعت خانہ کئی لاکھ کے سرمائے سے قایم کیا جائے جہاں مفید خوشنما ، ارزاں کتابیں ایک بڑی تعداد میں شایع کی جائیں اور وقتاً فوقتاً ملک کے اہل الرائے جمع ہو کر زبان کے تحفظ و ترقی کے متعلق مشورے کیا کریں اب جبکہ ہم نے مل کر ان باتوں کا فیصلہ کیا ہے اب ہمیں ملک کے ہر صوبے میں ہر بڑے چھوٹے شہر بلکہ ہر ہر گاؤں میں اپنی محبوب زبان کی خدمت کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے ؛

حروف اور رسم خط کی اصلاح ، اعراب و علامات کا تعین ، تلفظ ، املا ، متروکات ، اصطلاحات ، ٹائپ اور بیسیوں اور مسائل ہیں جن کا حل جلد سے جلد ہونا چاہیئے ؛

انجمن ترقی اردو نے تجویز کی ہے کہ زیر ترتیب اردو لغات شائع کرنے کے علاوہ انتظام کیا جائے گا کہ دنیا کی مختلف بڑی زبانوں کی تقریباً ایک سو پچاس بہترین کتب کو اُردو میں منتقل کر دیا جائے۔ لیکن علمِ ادب کی ترقی میں سب سے زیادہ ضروری اور قابل لحاظ امر یہ ہے کہ اُردو میں جدّت پسند اور حیات انگیز خیالات کی ترویج کی جائے اور غمگین و یاس خیز خیالات کا سدّباب کیا جائے۔ عوام کو ادب سے اور ادب کو عوام سے روشناس کرایا جائے یہاں تک کہ روزمرہ کی زندگی اور مہذب دنیا کی تحریکات ہمارے ادب میں لہریں لینے لگیں ؂

ہر چند کہ ہمارا ملک ابھی پستی کی تاریکیوں میں چھپا ہُوا ہے، شہروں میں ایک چھوٹی سی سیاست کا چرچا ہے، دیہات میں جہل اور افلاس کا دور دورہ ہے، ہندو مسلمان آئے دن لڑتے بھڑتے ہیں، ہم پر ابھی ایک غیر ملکی قوم حکمران ہے، ہمارے اخلاق بگڑے ہوئے ہیں ہم میں انسانیت کا جذبہ بھی ایک حد تک مفقود ہے تاہم یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اب ہر جگہ ایک انقلاب کے نہ سہی ایک تبدیلی کے آثار ضرور نمایاں ہیں۔ شمال میں اقبال کا فلسفۂ عمل قوم کو بیدار کر رہا ہے اور ہزاروں ادیب اور غیر ادیب اس سے متاثر ہوئے ہیں بنگال سے نذرالاسلام کی شاعری ہر کہ ومہ کو انقلاب اور امید کا حیات بخش پیغام سنا رہی ہے، ترقی پسند مصنفین کی نئی انجمن ملک کے مختلف حصوں سے رجعت پرستی اور جمود کے خلاف اپنی آواز بلند کرنے کی مدعی ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب میں محاکات اور واقعیت پسندی کا رنگ صاف جھلک رہا ہے۔ غریبوں کی فاقہ کشی اور دکھ درد، ملک و قوم کی غلامی و پستی، عوام کی جہالت، قضا و قدر پر اعتقاد، مذہبی لوگوں کے توہمات، پیر پرستی، عورت کی ذلت، بچوں اور نوجوانوں کی غلط پرورش اور غلط تربیت، اور غلط تعلیم، لکھنے والوں کے قلم میں ہندوستانی زندگی کے ان مسائل نے ایک جنبش پیدا کر دی ہے! آج کسی قوم کا ادب اگر ان باتوں سے منہ موڑ کر نری ادب پرستی میں منہمک رہے گا تو وہ شاخ زندگی پر سے مرجھا کر گر پڑے گا اور مٹی میں مٹی ہو جائے گا ؂

اُردو کے متعلق یہ بیان غلط ہے کہ وہ ایک غیر ملکی یا صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ الزام لغو ہے کہ اس میں سوائے زلف و خال یار رونے دھونے کے قصوں کے اور کوئی بات نہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہماری زبان اور ادب میں ملکی و مقامی حالات و کیفیات کے اضافے کی گنجائش ہے، اس میں جدید تحریکات کا ولولہ اور جوش اور بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے اس سے صرف یہی نہیں کہ ہم اپنی زبان کی خدمت کریں گے۔ بلکہ اپنی زبان کے ذریعے سے ہم اپنی قوم اور اپنے ملک کی بھی صحیح خدمت کر سکیں گے یاد رکھو زبان کی ترقی کا سوال فی الحقیقت ہمارے ملک و قوم کی ترقی کا سوال ہے اگر ہماری زبان کو فروغ ہوگا تو اس سے ہماری زندگیاں بھی متاثر ہو جائیں گی البتہ ہم کو یہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ کوئی مُردہ دل کل صبح ہی اٹھ کر زندہ ادب پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لئے سچا اور بڑا ادیب وہی ہے جس کی زندگی سچی اور بڑی ہو اور وہی دوسروں میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے جو پہلے خود اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کرے۔ اور اسی لئے

اُردو زبان کی ترقی کا آوازہ درحقیقت ہماری زندگی کی ترقی کا نعرہ ہے !

ہمایوں کے قارئین اور قلمی معاونین کو شاید یہ شکایت ہو گی کہ میں نے اس دفعہ ان سے بزمِ ہمایوں میں خلوت کی باتیں نہیں کیں نہ ان سے کوئی گذارش کی نہ ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اب خلوت و جلوت کا امتیاز اُٹھ گیا ہے اور باقی یہ عرض ہے کہ ایک ایسے نازک وقت میں جب دل خود بخود ایک دوسرے کی طرف کھچے چلے آتے ہوں گذارش و شکریہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی

بشیر احمد

میں اپنے خیالات تقریباً قلمبند کر چکا تھا۔ کہ مسٹر کاکا کالیلکر صاحب بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے آنریری سکرٹری مجھ سے ملنے آئے وہ شمالی ہند کا اس غرض سے دورہ کر رہے تھے کہ پرشد کے کام کی اشاعت کریں اور ان "غلط فہمیوں" کو دور کریں جو خصوصاً پرشد کے "ہندی یعنی ہندوستانی" ریزولیوشن سے اُردو والوں کے دلوں میں پیدا ہو گئی ہیں۔ میری ان کی طویل گفتگو ہوئی۔ انہوں نے سلیس ہندوستانی میں جس میں کچھ ہندی کے الفاظ اور کچھ انگریزی کے جملے شامل تھے مجھے بتایا کہ ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ملک کی قومی زبان وہ زبان ہے جسے شمالی ہند کے ہندو مسلمان شہروں اور دیہات میں بولتے اور سمجھتے ہیں اور جو اردو اور ناگری دو رسم الخطوں میں لکھی ہوئی پائی جاتی ہے پھر کہا کہ ہمیں چاہیئے کہ اردو اور ہندی میں بڑے بڑے بھاری بھرکم الفاظ کی بجائے آسان لفظ وضع کریں تاکہ وہ ملکی زبان کا جزو بن سکیں ؛

میں نے کہا کہ مہاتما گاندھی سے ہماری کم از کم توقع یہ ہے کہ وہ زبان کے اس اہم مسئلے کو حل کرنے کے لئے عملی طور پر کوئی کام کریں اور وہ اس طرح کہ پہلے پنڈت جواہر لال کی طرح صاف لفظوں میں اعلان کر دیں کہ ہندوستان کی ملکی زبان ہندوستانی ہے جو اُردو اور ناگری دو رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک ہفتہ وار اخبار کا اجرا کریں۔ جو دونوں رسم الخطوں میں شائع ہو یعنی مضمون ایک ہی زبان میں ہو۔ لیکن وہ دو کالموں میں اردو اور ناگری حروف میں درج کیا جائے اس سے نہ صرف مہاتما جی کی پوزیشن واضح ہو جائے گی اور مسلمانوں اور دوسرے اردو والوں کے دل سے تمام وہ شبہات مٹ جائیں گے جو پرشد کی کارروائی سے پیدا ہو گئے ہیں۔ بلکہ ایک قومی زبان کی ساخت اور ترقی میں خاصا اضافہ ہو گا۔ افسوس ہے کہ کاکا کالیلکر صاحب میرے اس خیال سے متفق نہ ہو سکے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پرشد کی "اتھوا ہندوستانی" حقیقت میں ہندی ہی ہے ؛

ب ل

جو کرنا ہے کر آج اسی وقت، ابھی !

یہی زندگی ہے ، یہی زندگی !

ب ر

جہاں نما

اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جنگ عظیم کے بعد گذشتہ اٹھارہ سالوں میں ۱۹۳۶ء سب سے خطرناک اور ہنگامہ خیز سال گذرا ہے یوں تو ۱۹۲۹ء کی سرد بازاری سے لے کر آج تک سرمایہ دار دنیا کو چین کی نیند کبھی نصیب نہیں ہوئی لیکن یہ ظاہر ہے کہ بین الاقوامی جنگ کا خطرہ جیسے متمدن دنیا پر پچھلے سال میں چھایا رہا ہے ایسا پہلے کبھی کم چھایا ہو گا ۱۹۱۴ء میں بھی جنگ عظیم کے چھڑنے کے وقت حالت بظاہر اس قدر مخدوش نہ تھی جیسی اب کچھ عرصے سے ہو رہی ہے۔ پچھلے سال میں ایک نہیں کئی واقعات ایسے پیش آئے ہیں جن سے بآسانی ایک ہیبت ناک جنگ کا آغاز ہو سکتا تھا لیکن تاحال ایسا نہیں ہوا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں فقط ظاہرہ شور و غل ہے جس کا کوئی برا نتیجہ نہ نکلے گا۔ لیکن عام طور پر قوموں اور ان کے رہنماؤں کو یقین ہو رہا ہے کہ بین الاقوامی جنگ اب قریب ہی ہے اور دیر تک رک نہ سکے گی بات یہ ہے کہ اس تو تو میں میں کے ساتھ اب در پردہ نہیں بلکہ علانیہ طور پر بری و بحری و فضائی جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اطالیہ کے تشدد نے اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ جرمنی نے ورسائی کے عہدنامے کے ٹکڑے کر کے اسے رائن میں بہا دیا ہے۔ جاپان نے منچوریا کے بعد منگولیا کی گردن جا دبوچی ہے اور زور و قوت کے ان مظاہروں پر کوئی پردہ نہیں ڈالا گیا کوئی معذرت پیش نہیں کی گئی۔ جو کچھ ہوا اسے صاف صاف کہا اور کیا گیا ہے۔ ان کا قول اور رویہ یہ ہے کہ ہم محروم ہیں لیکن مستحق ہیں اور ضرورتمند ہیں اور دوسرے قابض ہیں اور ضرورت سے زیادہ پر قابض ہیں، اس لئے ہمارا حق ہے کہ ہم زور بازو سے وہ چیزیں حاصل کریں جو صلح صفائی سے ہمیں نہیں مل سکتیں۔ بدقسمتی سے ان میں سے اکثر مقبوضات اور اکثر چیزوں کی اصلی مالک وہ کمزور قومیں ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے آپ اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں سو طاقتوروں کے اس لڑائی جھگڑے میں آٹے کے ساتھ یہ گھن بھی پس رہا ہے اور پس کے رہے گا:

ایک اکھاڑہ تیار ہو رہا ہے جس میں ایک طرف اطالیہ اور جرمنی اور جاپان ڈنڈ پیل رہے ہیں۔ اور دوسری طرف فرانس اور روس اور انگلستان کھڑے ان کو کنکھیوں سے دیکھ رہے ہیں۔ فرانس کہنے کو ایک جمہوری ملک ہے لیکن ایک وسیع سلطنت کا مالک ہے روس اشتمالیت کا مسکن ہے لیکن اس کے پھیلے ہوئے پُرامن علاقوں پر للچائی ہوئی نظریں پڑنا ایک فطری امر ہے۔ انگلستان کی سلطنت پر سورج ہی کبھی غروب نہیں ہوتا اس پر تو ہی نادار قوموں کو کیونکر رشک نہ آئے؟

ورسائی کے عہدنامے کے مطابق جرمنی کو اس کی گستاخی کی سزا دی گئی، اس کا گھر بار لٹا۔ اس کی جائداد چھنی۔ اور بدقسمتی سے

جیسا کہ انسانی دستور ہے یہ لوٹ کھسوٹ حد سے بڑھ کر ہوئی اور دیر تک جاری رہی۔ قدرتی طور پر اس کا دل غم و غصہ سے لبریز رہا۔ جاپان اتحادیوں کا حلیف تھا لیکن ایک وہ دور افتادہ تھا، دوسرے سفید نسل سے نہ تھا۔ اسے سمجھایا گیا کہ پہلے میاں تم نے کون سے تیر مارے ہیں۔ کہ تم گوروں کی مجلس میں برابری کے دعوے دار بن بیٹھو۔ ادہر اطالیہ نے جرمنی اور آسٹریا ہنگری سے بے وفائی کی تھی اور اتحادیوں سے رشتہ جوڑا تھا۔ لیکن اس بے وفائی اور رشتے ناتے پر بھی اتحادیوں نے اس سے بے اعتنائی ہی برتی۔ جرمنی اور اطالیہ اور جرمنی نے محسوس کیا کہ نام نہاد مجلس اقوام میں انہیں کبھی برابری حاصل نہ ہو گی لہذا وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ علیحدگی فرقہ بندی کا موجب بنی۔ ادہر اطالیہ میں مسولینی اور اُدہر جرمنی میں ہٹلر نے طاقت حاصل کی ؛

ان قوموں نے دیکھا۔ کہ اس تھوڑے سے عرصے میں اس تگ و دو سے ان کی رگوں میں خون دوڑنے لگ گیا اور دوسری قومیں واقعی ان سے ڈرنے دبنے لگ گئیں۔ انہیں قومی طاقت میں لطف آنے لگا۔ وہ مدتوں کے بعد پھر سمجھیں کہ ہم زندہ ہیں اور قومی جمہوریت، اشتراکیت اشتمالیت وہ یہ سب بھول گئیں اور انہوں نے اپنے آپ کو ایک بے پناہ **فاشیت** کے سپرد کر دیا۔ جس میں ان کی انفرادی آزادی اور شخصیت چھن کر ایک ایسے قومی نظام میں گم ہو گئیں جس کی باگ ڈور فقط ایک مطلق العنان آمر اور اس کے حواریوں کے ہاتھ میں آ گئی ؛

۱۹۳۶ء پر ایک سرسری نظر ڈالو۔ تو اس ناٹک کے یہ منظر یکے بعد دیگرے دکھائی دیتے ہیں :۔

جنوری :۔ اطالیہ کا مسولینی حبشہ کو نیچے گرا کر اس کے گلے پر خوب اپنی تیز چھری پھیر رہا ہے ؛

فروری :۔ فرانس اور روس کا معاہدہ تکمیل کو پہنچتا ہے ؛

۷ رمارچ :۔ جرمنی رائین کی وادی میں معاہدہ ورسائی کی شرائط کے خلاف اپنی فوجیں بھیجتا ہے ؛

۱۲ راپریل :۔ انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوتا ہے ؛

۵ رمئی :۔ اطالیہ حبشہ کو فتح کر لیتا ہے ؛

جولائی :۔ لیگ اطالیہ کے خلاف معاشی اقدامات کی کارروائی ترک کر دیتی ہے ؛

" ۲۰ ر :۔ دردانیال میں ازسرنو قلعے بنا کر اس کی حفاظت کے متعلق ترکی کا دوسری قوموں سے سمجھوتا ہوتا ہے ؛

۲۶ راگست :۔ مصر اور انگلستان آپس میں معاہدہ کرتے ہیں ؛

ادہر ہسپانیہ میں خانہ جنگی کا بازار گرم ہوتا ہے ادہر چین میں ؛

۱۱ رستمبر :۔ جرمنی اپنی چھنی ہوئی نوآبادیوں کی واپسی کے متعلق شور و غل مچاتا ہے ؛

۱۶ را کتوبر :۔ بمبئی میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کو مار پیٹ کر قومی اتحاد کا کمال دنیا کو دکھاتے ہیں ؛

جرمنی اور اطالیہ میں ایک مفاہمت ہو جاتی ہے ؏

نومبر:- جرمنی کا ہٹلر اعلان کرتا ہے۔ کہ عہدنامہ ورسائی نے جو بندشیں جرمن دریاؤں پر عائد کی تھیں وہ توڑ دی گئی ہیں ؏

اشتمالیت کے خلاف جاپان اور جرمنی کا معاہدہ مکمل ہو جاتا ہے ؏

جاپان اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا منگولیا کی سرحدوں پر چہل قدمی کرتا ہے ؏

فاشیت اور اشتمالیت سپین میں گتھم گتھا ہوتی ہیں۔ جرمنی اور اطالیہ باغیوں کو مدد دیتے ہیں اور روس سپین کی حکومت کو ؏

انگلستان اپنا صلح کا نقارہ بجاتا ہے اور جرمنی اور اطالیہ سے کہتا ہے کہ آؤ مغرب میں ایک نئے عہدنامہ "لوکارنو" کی بنیاد ڈالیں۔ روسی ریچھ جرمنی پر اپنے دانت پیستا ہے جرمن عقاب روس کو اپنے پنجے دکھاتا ہے ؏

۱۰ دسمبر:- انگلستان کا ایڈورڈ ہشتم اپنی محبوبہ کے لئے تخت و تاج سے دست بردار ہو جاتا ہے ؏

اگر ان سب واقعات کا عملاً کوئی اہم نتیجہ نہ نکلے تو یہ ڈراما بہت دلچسپ ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر گذرے سال کی اچھی بُری باتوں کا وارث ہر آنے والے سال کو بننا پڑتا ہے ؏

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اطالیہ نے حبشہ پر حملہ کیا تھا۔ انگلستان اور فرانس نے لیگ کے "ماں باپ" بن کر لیگ سے صدائے احتجاج بلند کرائی۔ انگلستان جانتا تھا کہ بحیرۂ روم و بحیرۂ قلزم میں اطالیہ کا عمل دخل اس کے مفاد کے خلاف ہے لیکن فرانس یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح اطالیہ کو زیادہ ناراض بھی نہ کر دے کہ کہیں وہ جا ادھر جرمنی سے ملے سو اس نے اندر ہی اندر اطالیہ سے کہہ دیا کہ ہم چیختے چلاتے ہیں تم اتنے میں کالی نسل پر ہاتھ صاف کر لو۔ ادھر اطالیہ کو فرانس کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ وہ اس سے ڈر رہا ہے تو اس نے ۱۹۳۶ء کے شروع میں درپردہ جرمنی سے مفاہمت کرنی شروع کر دی اس سے جرمنی کو شہ ملی تو اس نے رائین کے ممنوعہ علاقے میں اپنی فوجیں جا اتاریں کہ یہ میرا ملک ہے میں کیوں نہ اس کی حفاظت کروں اور بہانہ یہ تراشا کہ فرانس نے کیوں روس کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہے۔ ادھر جاپان نے ان سب کو مصروف دیکھ کر پہلے تو بحری کانفرنس سے علیحدگی اختیار کی اور انگلستان اور امریکہ کے ساتھ بحری برابری کا دعوے کیا اور اس کے ساتھ ہی منچوریا سے گذر کر اندرونی و بیرونی منگولیا پر اپنا گھٹاٹوپ ڈال دیا۔ اس چالاکی پر روس نے واویلا مچایا لیکن مغرب کے شور و غل میں کسے ہوش تھا کہ ادھر متوجہ ہوتا۔ اور جاپان نے امریکہ اور انگلستان سے سنجیدہ بن کر کہا کہ سُرخ خطرے سے بچنا چاہتے ہو تو میری زبردستی کو اپنی عین حفاظت سمجھو۔

جرمنی، اطالیہ، جاپان، تینوں کے مفاد مشترک ہیں اور کسی طرح ایک دوسرے کے خلاف نہیں۔ جرمنی اپنے اقتدار کو یورپ میں اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو افریقہ میں حاصل کرنا چاہتا ہے ادھر اس کے حریف فرانس اور روس ہیں ادھر انگلستان۔ اطالیہ بحیرۂ روم اور افریقہ میں طاقت بڑھانا چاہتا ہے اس کا حریف ایک حد تک فرانس لیکن زیادہ تر انگلستان ہے۔ جاپان شمالی و مشرقی ایشیا پر نظر رکھتا ہے جہاں روس کا قبضہ ہے۔ تینوں خام پیداوار کے طلبگار ہیں، اور اپنی تجارت بڑھانے کے خواہشمند۔ تینوں کا فائدہ امن و امان میں کم ہے اور جنگ و فساد میں زیادہ۔ جرمنی کو یورپ میں اقتدار نہیں مل سکتا جب تک

فرانس کو زک نہ پہنچے اور نو آبادیاں نہیں مل سکتیں جب تک انگلستان کو ڈرایا دھمکایا نہ جائے اور اطالیہ کا کمال برطانیہ کے زوال ہی سے ہو سکتا ہے مسولینی رومی سلطنت کا خواب دیکھ رہا ہے جو برطانوی سلطنت کے ہوتے خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ جاپان سارے ایشیا پر چھا جانے کا آرزومند ہے، اس خطرے سے بچنے کی ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے سرمایہ دار انگلستان اور اشتمالی روس کی مفاہمت! کیا یہ ممکن ہے؟ سیاست کی بساط پر کوئی چال بھی ناممکن نہیں +

سو جنگ کے لئے دنیا تیار ہو رہی ہے۔ لیکن کیا دنیا بھول چکی ہے کہ جنگ عظیم میں مقتولین کی تعداد تقریباً ایک کروڑ اور زخمیوں کی تقریباً دو کروڑ تھی اور مالی نقصان ½ ۸ کھرب یعنی پچاس ہزار کروڑ روپے سے زائد تھا؟ کیا دنیا یہ بھول چکی ہے؟ اور کیا دنیا کو یہ معلوم نہیں کہ آئندہ جنگ میں پیرس یا لندن یا برلن پر صرف آدھے گھنٹے میں اتنے بم گرائے جا سکیں گے کہ کم از کم دو لاکھ شہری ہلاک یا مجروح ہو جائیں گے اور مجروح بھی اکثر اندھے بہرے گونگے لنگڑے؟ اور شہروں کے شہر اور کارخانے اور ریل تار بجلی اور عجائب خانے کتب خانے تفریح گاہیں اکثر تباہ و برباد ہو جائیں گی؟ فوجیں خندقوں میں ڈٹی رہیں گی اور جہاز اور ان کی توپیں گولوں سے لبریز رہیں گی اور ادھر ملک کے لاکھوں باشندے قیامت کا شور مچائیں گے کہ ہم اور ہمارے بچے ملیا میٹ ہو گئے خدا کے واسطے صلح کرو اور دشمنوں کو دے دو جو وہ مانگیں! کیا خواص و عوام کو ان باتوں کا علم ہے اور علم ہے تو پورا احساس ہے یا نہیں ہے؟

موجودہ بے چینی اور بعض قوموں کی جنگ پسندی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ زندگی کی جد و جہد بہت بڑھ گئی ہے، متمدن دنیا اس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے کہ عقلمند سے عقلمند آدمی بھی اس کی سب الجھنوں کو سلجھا نہیں سکتا۔ اس حالت میں عوام کو جدھر دھکیلا جاتا ہے وہ ادھر ہی کو جھک جاتے ہیں، معاشی سرد بازاری، بے روزگاری، مساوات کا احساس، جنسیت کا زور، قوموں کی رقابت، رسمی مذاہب سے بیزاری، معلومات کی فراوانی، اور مصروفیات کی کثرت، ان اور ایسے ہی بہت سے دوسرے خیالات و حالات نے اکثر لوگوں کا ذہنی توازن کھو دیا ہے، اور وہ خود سوچنے اور سمجھنے اور اطمینان سے کچھ کر سکنے کے قابل نہیں رہے +

عجب نہیں کہ یہ دماغی خلل محض عارضی ہو، عجب نہیں کہ یہ زمانہ آگے بڑھ کر پیچھے ہٹ رہا ہے محض اس لئے کہ یہ اور زیادہ شد و مد سے پھر آگے بڑھے۔ عجب نہیں کہ فرد نے اپنی آزادی کو محض عارضی طور پر کھویا ہے اور آنے والے زمانے میں عنقریب وہ پھر بیش از بیش اپنی دور اندیشی اور دلبری اور خودداری کو زیادہ اعتماد کے ساتھ حاصل کرلے +

لیکن اس وقت حالت نازک ضرور ہے جنگ عظیم کی تباہیوں کے اندر سے کم از کم ایک نئی چیز نکلی تھی لیگ! لیکن اس کا جو حشر ہوا ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ وہ محض ایک جماعت کی جمعیت بن کر رہ گئی ہے یہ ضرور ہے کہ کئی چھوٹے چھوٹے معاملات میں مثلاً مزدوروں کی ابتر حالت، بچوں اور عورتوں کے حقوق، غلاموں کی تجارت، مسکرات کی فروخت، نیز بعض چھوٹے چھوٹے مناقشات کے انسداد میں لیگ نے مفید کام کیا ہے

لیکن جس اصلی غرض کے لئے وہ وجود میں آئی تھی یعنی قوموں کے باہمی تعلقات کا خوش اسلوبی سے سنبھاؤ اور سلجھاؤ۔ اس کام میں وہ محض ناکام رہی ہے، پہلے جاپان پھر اطالیہ پھر جرمنی اور اب سپین کے متعلق اس کی کوششیں یکے بعد دیگرے قطعاً بیکار ثابت ہوئی ہیں ۔ بغیر ایک بین الاقوامی زبردست فوج کے لیگ محض ایک قابلِ مضحکہ اور بے سود بین الاقوامی ادارہ ہے ؛

جنگِ عظیم کے بعد اشتراکیت بھی ابھری لیکن اس نے جلد روسی اشتمالیت کی شکل اختیار کر لی جس نے اپنے حیرت انگیز کارناموں سے دنیا کو حیرت میں ضرور ڈال دیا۔ لیکن جس کا ردِ عمل بہت جلد فاشیت کی صورت میں رونما ہو گیا اور اب اشتراکیت اور فاشیت ایک دوسری کی حریف بن کر ساری متمدن دنیا کو اپنا میدانِ جنگ بنانے پر آمادہ نظر آتی ہیں نتیجہ کچھ ہو اس وقت ان کی رقابت دنیا بھر کے لئے ایک عالمگیر مصیبت کا پیش خیمہ بن رہی ہے ؛

گذشتہ سال میں جن افراد کے نام ہمارے کانوں میں گونجتے رہے وہ یہ تھے ۔ مسولینی، ہٹلر، فرینکو ! اور جن ملکوں کے نام بار بار سنے وہ یہ تھے :۔ اطالیہ، حبشہ، جرمنی، جاپان، سپین لیکن تھوڑی دیر کے لئے کانوں کو بند کر کے آنکھوں سے بھی دیکھیں کہ دنیا کے مختلف ملکوں کی کیا حالت رہی ؛

انگلستان نے لیگ کو اطالیہ کے خلاف صف آرا کیا لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ دھمکیاں بہت دیں لیکن عملاً کچھ نہ کیا۔ ظاہر ہو گیا کہ اب ہوائی طاقت نے بحری طاقت پر غلبہ پا لیا ہے، انگلستان محسوس کرتا ہے کہ وہ تن تنہا اپنی ملکیت کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس کی اندرونی حالت تسلی بخش ہے لیکن بیرونی حالت یعنی دنیا میں اس کا اقتدار کم ہو رہا ہے وہ بمشکل اپنی پھیلی ہوئی سلطنت کو قائم رکھ سکے گا۔ اس کے باشندے بزدل نہیں لیکن ان میں وہ پہلی سی ہمت آزمائی باقی نہیں رہی وہ مصر سے، ترکی سے، جرمنی سے بلکہ فلسطین اور ہندوستان سے بھی کسی نہ کسی طرح کے سمجھوتے کے لئے تیار ہیں، وہ امن وامان چاہتے ہیں۔ فرانس میں اپریل میں اشتراکی حکومت قائم ہوئی اور اس نے مزدوروں کی مزدوری بڑھا دی اور ان کی محنت کے اوقات میں کمی کر دی لیکن بے چینی دور نہ ہوئی، چیزوں کی گرانی، بھاری ٹیکس، ہڑتالیں، جرمنی کا ڈر، انگلستان پر شبہ یہ موجود ہے۔ مشرقی یورپ میں جو اتحادوں کا سلسلہ فرانس نے قائم کیا تھا۔ اس کی کڑیاں کمزور ہونی شروع ہوئیں۔ اور اسی لئے فرانس نے اشتمالی روس سے اپنا معاہدہ پکا کر لیا ؛

روس نے سوویٹ کے آئین میں تبدیلیاں کر کے ایک نیا جمہوری دستور نافذ کیا ہے جس میں دو آئینی مجلسیں ہوں گی اس سے اور فرانسیسی معاہدے سے ظاہر ہے کہ اب روس علیحدگی پسند نہیں رہا اب وہ سمجھ رہا ہے کہ اس دنیا میں رہنا ہے تو ایک حد تک عام تمدن سیاسی معیار کا لحاظ رکھنا ہے اور دوسروں سے تعلقات بھی استوار کرنے ہیں بلکہ اس نئے رابطے سے شاید اس کی اشتمالیت کا چپکے چپکے دنیا میں زیادہ چرچا ہو جائے، اور اگر وہ بدستور سب سے الگ تھلگ رہا، تو عجب نہیں کہ دوسروں کے اتحادوں کا شکنجہ اسے ہلاک کر دینے میں کامیاب ہو جائے۔ روس کی اندرونی حالت بہتر ہو رہی ہے، ماسکو میں سینکڑوں نئی عمارتیں بن رہی ہیں اور شہروں اور دیہاتوں میں ہزاروں نئے سکول اور شفاخانے ، اور تربیت گاہیں قائم ہو گئی ہیں کھیت اب کھلے ہیں باڑوں سے گھرے ہوئے نہیں، ذرائع آمد و رفت میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں، اور گو ابھی

نئے انتظام میں بہت سی کمیاں موجود ہیں لیکن جدتوں نے ملک کی کایا پلٹ دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ روس کی ہوائی طاقت دنیا بھر میں سب سے بڑی ہے، روس اُدھر جاپان اور ادھر جرمنی کے مقابلے کے لئے تیار ہو رہا ہے ۔

جرمنی نے بین الاقوامی دنیا میں پھر ۱۹۱۴ء کی طرح اپنا رعب بٹھا لیا ہے۔ اس کی فوجیں پھر دریائے رائین پر قابض ہو گئی ہیں۔ اس کے دریاؤں میں جہاز رانی کا حق اب بغیر اس کی اجازت کے کسی کو حاصل نہ رہے گا سو فرانس کے حلیف چیکوسلوواکیا کو اب اس کا دست نگر ہونا پڑے گا۔ فرانس کے دوسرے حلیف پولینڈ نے بھی اس کا سمجھوتہ ہو چکا ہے آسٹریا اور ہنگری اب جرمنی اور اطالیہ کے طرفدار ہیں اور اطالیہ اور جرمنی اور جاپان دراصل ایک اتحادی سلسلے میں منسلک ہو چکے ہیں جب جرمن فوجیں رائین پر اتریں تو فرانس انگلستان بلجیم اور لطف یہ کہ اطالیہ نے بھی احتجاج کیا لیکن جرمنی اس احتجاج کے لیئے تیار تھا۔ جولائی میں آسٹریا نے اپنے آپ کو ایک جرمن سلطنت ہونا تسلیم کیا۔ اگست میں ہٹلر نے جرمن فوج کو دگنا کر دینے کا اعلان کیا۔ ستمبر میں نو آبادیوں کی واپسی کا مطالبہ ہوا۔ اکتوبر میں چار سالہ پروگرام نافذ ہوا نومبر میں جرمن دریاؤں کی آزادی کا ڈنکا بجا اور جرمنی اور جاپان کے معاہدے کا غلغلہ برپا ہوا۔ دسمبر میں سپین میں جرمن فوجیں باغیوں کی کمک کے لئے جا اتریں۔ غرض ایک سال کے اندر جرمنی قوموں کی مجلس میں ہر طرح سے ایک آزاد اور باوقار ملک بن گیا۔ ورسائی کی بیڑیاں اس نے ایک ایک کر کے اپنی تیز تلوار سے کاٹ کے رکھ دیں۔ لیکن جرمنی کی اندرونی حالت زیادہ تسلی بخش نہیں اور انفرادی آزادی کا حال بھی پتلا ہو رہا ہے مگر اس نازک وقت میں سب طوعاً و کرہاً "ہیل ہٹلر" کہنے پر آمادہ ہیں ۔

اطالیہ کو مسولینی نے کمزور سے شہ زور بنا دیا ہے اگو ابھی یہ دیکھنا ہے کہ کہاں تک اس زور و قوت کی بنیاد مضبوط ہو چکی ہے لیکن اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ اس نے دنیا بھر کے تنفقر لیگ پسندوں کے دانت بُری طرح کھٹے کیے ہیں اور انگلستان کو ایسا نیچا دکھایا ہے کہ اس کی کم مثالیں موجود ہیں۔ مسولینی نے جو کہا وہ کر دکھایا حبشہ کو زور فتح کیا۔ اس کے معصوم باشندوں پر بم برسائے گیسیں اڑائیں غرض ہر طرح انہیں پسپا اور زیرنگیں کر لیا اور جب فرانس اور انگلستان وغیرہ نے ان تشدد کے طریقوں کو برا بھلا کہا تو اس نے کھلے بندوں کہہ دیا۔ کہ "کل روا رکھا تھا تم نے میں روا رکھتا ہوں آج" مسولینی نہ صرف وسطی یورپ میں اپنی تلوار زوروں سے گھما رہا ہے بلکہ وہ بحیرۂ روم کو ایک رومن جھیل بنانے کے درپے ہے، وہ سپین میں باغیوں کو مدد دے رہا ہے اور وہ پھر رومن سلطنت کے قیام کے خواب دیکھتے ہوئے انگلستان کی سلطنت پر حرص اور غصے کی نظریں ڈال رہا ہے ۔

مئی میں اطالوی ادیس ابابا میں داخل ہوئے۔ جون میں انگلستان نے اور جولائی میں لیگ نے اپنے معاشی اقدامات چھوڑ دیئے اکتوبر میں جرمنی اور اطالیہ نے معاہدہ کر لیا۔ نومبر میں انہوں نے سپین کے باغی جنرل فرینکو کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ مسولینی اپنے آپ کو صرف اطالیہ کا نہیں یورپ بھر کا آمر سمجھے ہوئے ہے مگر اس میں ہٹلر اس کا حامی بھی ہے اور رقیب بھی۔ انفرادی آزادی کا حال اطالیہ میں بھی برا ہی ہے لیکن آج کل اطالیہ اور جرمنی اور روس اور بعض اور ملکوں میں بھی اکثر لوگ انفرادی آزادی کو اجتماعی قوت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا چکے

تُلے ہوئے ہیں ؛

جاپان یورپ کو اپنے لڑائی جھگڑوں میں مصروف دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے چین کی سلطنت اور دنیا کی تجارت سمیٹ رہا ہے فوجی طاقت وہاں زوروں پر ہے اور رعایا کے خیالات کو ایک خاص سلیقے میں ڈھالنے میں وہ فاشیوں نازیوں سے کم نہیں، بڑھ کر ہے، ایشیا بھر کی حکومت اس کے پیش نظر ہے، منچوریا، منگولیا، چین، ایشیائی روس، آسٹریلیا، ہندوستان یہ ان سب کو ہڑپ کرنے کی فکر میں ہے۔ لیکن تدریج جاپان دیکھ رہا ہے کہ اب بہت کچھ کرنے کا موقع ہے، اس نے "مغربی تمدن کے تحفظ" کی خاطر جرمنی سے ایک معاہدہ طے کیا ہے، خدا کا شکر ہے کہ یہ وقت بھی آگیا ہے کہ ایک ایشیائی طاقت یورپ کی تہذیب کی حفاظت کی ذمہ دار بنتی ہے اب تک گورے گورے لوگ ہی پس ماندوں کے بچاؤ کی تدبیریں کرتے تھے۔ اب ایشیائیوں میں بھی انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے ؛

امریکہ نے نومبر میں روزولٹ کو دوبارہ اپنا صدر منتخب کر کے اس کی "نوعملی" پر اپنی مہر ثبت کر دی ہے ۱۹۳۳ء میں جب روزولٹ پہلے پہل صدر بنا تو امریکن نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ بنک بند ہو رہے تھے، ۲ کروڑ آدمی بے روزگار تھے۔ نئے صدر نے ایک نیا معاشی پروگرام نافذ کیا اور جمہوریت میں ذرا سی اشتراکیت گوندھ کر اس کا ایک عمدہ مقوی مرکب تیار کیا۔ جس سے نیم مردہ ملک میں پھر خوشحالی کا خون دوڑ گیا۔ امریکہ تاحال علیحدگی کا قائل ہے اور یورپ کے جھگڑوں جھمیلوں سے اپنے آپ کو الگ رکھنا چاہتا ہے لیکن عجب نہیں کہ جاپان کی بڑھتی ہوئی طاقت اسے بین الاقوامی دنگل میں اتر آنے پر مجبور کر دے ؛

سپین کی خانہ جنگی جو جولائی میں شروع ہوئی ابھی تک جاری ہے۔ بادشاہت چھوڑ کر پچھلے پانچ سال میں سپین نے آرام نہیں پایا اس کے قومی جھگڑے کی حیثیت اب بین الاقوامی ہو گئی ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اب محض حکومت اور باغیوں کی جنگ نہیں رہی بلکہ فاشیت و اشتراکیت کا معرکہ بن گیا ہے ایک طرف روسی اور شاید فرانسیسی ہیں اور دوسری طرف اطالوی جرمن پرتگالی اور شاید کچھ برطانوی ؛

ترکی نے اطالیہ کے تیور بدلے دیکھ کر دردانیال کی قلعہ بندی کا حق پھر حاصل کر لیا ہے، اتاترک کی حکمت عملی واقعی قابل تعریف ہے، یورپ میں اس نے بلقانی ممالک کے ساتھ معاہدے کر لئے ہیں اور ایشیا میں اس نے تقریباً تمام اسلامی حکومتوں کا ایک اتحاد قائم کر دیا ہے۔ ترکی کی صنعت و حرفت ترقی کر رہی ہے اور اس نے انگلستان سے ایک تجارتی سمجھوتہ کیا ہے ؛

چیکوسلوواکیا۔ یگوسلوویا اور رومانیا جو "اتحاد صغیر" کے رکن ہیں۔ اور پولینڈ یہ سب محض فرانس کے حکم بردار بندے نہیں رہے اب جرمن طاقت بھی ان پر اپنا سایہ ڈال رہی ہے ؛

آسٹریا اور ہنگری اطالیہ اور جرمنی کے نام لیوا ہیں۔ یہ نہیں معلوم کس کے زیادہ ہیں کس کے کم ؟

یونان میں اگست سے آمریت قائم ہو چکی ہے ؛

مصر نے اطالوی جوع الارض کی نشانیاں دیکھ کر بخوشی انگلستان سے ایک معاہدہ کرلیا ہے۔ جس کے مطابق اسے نیم آزادی حاصل ہونے کا امکان نظر آتا ہے ؛

فلسطین میں عربوں نے مئی میں برطانیہ کی یہود نوازی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ اکتوبر میں لندن سے ایک کمیشن اس مسئلے کے حل کرنے کو بھیجا گیا جو ابھی اپنا کام کر رہا ہے ؛

حبشہ کی "شرارت" ابھی ختم نہیں ہوئی، اطالوی اسے بزور مہذب بنانے میں مصروف ہیں اور مصروف یوروپ حبشہ کو بھول چکا ہے ؛

چین کا رنگ روس کے سرخ اور جاپان کے زرد خطرے کے درمیان فق ہو رہا ہے ؛

ہندوستان کا اس خطرناک زمانے میں نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ اے میرے جنت وطن تجھے خطروں سے کیا خطر! تو تو آرام سے برطانوی امن کے مزے لوٹے جا! نہیں نہیں تو تو بہت مشغول ہے ہندو مسلم فساد میں اور منہمک ہے از سر تا پا نئے انتخابات کی جنگ میں! تجھ پر خدا اور پیشور دونوں کی رحمت ہو! واقعہ یہ ہے کہ جدوجہد کی اس دنیا میں پہلے مذہبی توہمات کے خمار اور امن و عافیت کے سلائے نے ہماری اصلی طاقت کی بیخ کنی کی اور پھر غلامی کی تاریکیوں میں نئی تہذیب کی برق پاشی نے ہماری نظروں کو چوندھیا کر ہمارے دماغ کو یوں چونکا دیا۔ کہ ہم لگے فرضی ترقی کے گڑھوں میں ٹامک ٹوئیے مارنے! ہندوستان کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔ وہم و مذہب کی آخری پناہ، قضا و قدر کی جولاں گاہ اگر کوئی ہے۔ تو یہی ملک۔ ہمارا ذہن ماشاءاللہ تیز ہے اور دماغ طاقتور ہے۔ لیکن ہماری نظر کوتاہ بین ہے اور دل بودا ہے۔ اور نصب العین مفقود، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر آج اتاترک کی طرح کا ایک ہندوستانی اس ملک کا آمر بن جائے۔ تو وہ نوجوانوں کی اٹھتی جوانیوں کی مدد سے اس عظیم الشان ملک کی کایا پلٹ دے بالفعل ایک طرف مذہبی و ملی فرقہ بندیاں ہیں اور دوسری طرف حاکمی و محکومی کے مسائل، انگلستان کے لئے قدرتی امر ہے کہ وہ اپنی سلطنت پر قابض رہنا چاہتا ہے، ہمارے لئے بھی فطری امر ہے۔ کہ اس طرح دوسروں کے سہارے پر جینے میں ہماری طاقتیں زائل ہوتی رہیں۔ لیکن زمانہ نرا قدرت اور فطرت کا مداح نہیں۔ وہ ہمیشہ بڑھا چلا جاتا ہے، وہ ہمیں بھی پکار رہا ہے، دیکھیں ہم کب اس کی آواز پر لبیک کہتے ہیں، ہمارے نوجوان ابھرنا چاہتے ہیں، نوجوانوں کی ایک تحریک اس ملک میں پیدا ہو رہی ہے۔ نری مذہبی اور ادبی تعلیم کی بجائے علمی اور صنعتی تعلیم کا آوازہ بلند ہو رہا ہے، دیہات سدھار کے لئے ادھر کانگرس، اور ادھر حکومت اپنی چال چل رہی ہے۔ عورتوں میں اپنے حقوق کے لئے احساس پیدا ہو رہا ہے، بعض ہندو عورتیں وراثت میں حصہ چاہتی ہیں، بعض مسلمان عورتیں انتخابات میں دیوانہ وار کام کر رہی ہیں، امداد باہمی کی رپورٹیں نکلتی ہیں، اشتراکیت نے جواہر لال نہرو سے پراثیار فرد پیدا کئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ اور پھر مشکل یہ ہے۔ کہ اپنا آٹا بھی تو اپنے بس میں نہیں۔ غرض حالت بے حد مایوس کن ہے۔ لیکن کوئی خود دار اس مایوسی کے آگے

سر تسلیم خم نہیں کرسکتا، کوئی انسان جس کے سینے میں دل ہے۔ فقط آنسو بہانے پر قناعت نہیں کرسکتا۔ آج وہ زمانہ آگیا ہے، کہ اس سب سے پس ماندہ قوم کی رگوں میں بھی خون دوڑے، آج اس حالت میں بھی ہندوستان بعض وہ آدمی بڑے اور چھوٹے نامور اور گمنام پیدا کررہا ہے۔ جن کے وجود پر انسانیت بجا طور پر فخر کرسکتی ہے!

دُنیا کی عام تحریکات کیا ہیں؟

عورتیں، نوجوان، مزدور ان کی طاقت بڑھ رہی ہے۔ پروپیگنڈا ہوائی قوت تنظیم ان کا بول بالا ہے۔ جن ملکوں میں ان سے کام لیا جاتا ہے۔ وہ ملک اُبھر رہے ہیں۔ جہاں ان سے کام نہیں لیا جاتا وہاں زندگی مٹی میں مٹی ہو رہی ہے۔

روس میں عورتوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ حکومت کے مقامی اداروں میں عورتیں زیادہ ہیں۔ مردکم، پارچہ بانی، ریل، طبّی تفتیش، اور ان سے بڑھ کر تعلیم، قانونی پیشہ، سنیما، عجائب خانے، ان میں عورتوں کو زیادہ دخل ہے۔ اور کتب خانوں اور کتب فروشی کی دکانوں میں تو مرد نظر ہی نہیں آتے، فوج میں بھی ان کا حصہ ہے، ماسکو کے بچوں کی صحت کے مرکز دنیا میں بہترین ہیں۔ اور وہاں دوسو ایسی حفاظت گاہیں ہیں، جہاں مزدور مائیں اپنے بچوں کو حکومت کی نگرانی میں چھوڑ سکتی ہیں روس کی عورتیں غازہ نہیں لگاتیں نہ لبوں پر سرخی لگاتی ہیں۔ ان کی زندگی محض سانس لینا نہیں، ان کے لئے زندگی کے معنی کام کرنا ہے۔ جرمنی میں نوجوان لڑکیوں کے ادارے میں بارہ ہزار لڑکیاں ہیں۔ جن کا کام محنت کش عورتوں کی ان کے گھر میں جا کر مدد کرنا ہے۔ انگلستان میں مئی ۱۹۳۶ء میں ایمی مولی سن انگلستان سے کیپ ٹاؤن تک اُڑی، اور پھر اُڑتی واپس آئی۔ اس نے بارہ ہزار میل سے زائد تقریباً ۱۱ دن میں طے کئے۔ اکتوبر میں مس بیٹن نے انگلستان سے آسٹریلیا تک دس ہزار میل کا سفر تن تنہا تقریباً ۶ دن میں طے کرلیا۔ اس بات میں یہ دونوں مردوں سے بھی سبقت لے گئیں۔ سپین میں عورتیں میڈرڈ کی حفاظت میں جان توڑ کر لڑتی رہیں۔ مصر اور ایران میں انہوں نے نقاب اُتار پھینکا ہے۔

نوجوانوں کی تحریکات جس قدر عام ہو رہی ہیں۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے۔ کہ ہندوستان سے دقیانوسی ملک میں بھی طلبہ اور دوسرے نوجوان اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں۔ نتیجہ زیادہ شاندار ہو نہ ہو تحریک کا وجود ثابت کرتا ہے۔ کہ زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

مزدور تحریک کے سلسلے میں لاہور میں بھی ایک بے روزگاروں کی لیگ بنی، اور ایک نوجوان نے اپنے غلط کار جوش میں "کار سوزی" کا انقلابی مشغلہ بھی اختیار کرلیا۔ پیام عمل جو دنیائے حاضر ہر کہ ومہ کے کان میں پھونک رہی ہے۔ یہ بھی اسی کا ایک کرشمہ ہے۔ کیا ہم غریبوں کو بھی اسی رستے سے ہو کر تہذیب و ترقی کے نصب العین کی طرف جانا ہے؟

پروپگنڈا کی ایک مثال اطالیہ ہے۔ جہاں کوئی خبر مسولینا نہ احتساب کی منظوری کے بغیر شائع نہیں ہوسکتی۔ حال میں روما میں ایک فلم تیار ہو رہا ہے۔ جس میں روما اور کارتھیج کی قدیمی لڑائیوں کا نقشہ پیش کیا جائے گا۔ اور جس میں روما کا غلبہ اور قوت دکھا کر حال کے اطالویوں کو دنیا کے تسخیر کرنے کی ترغیب دی جائے گی ؛

ہوائی طاقت کا موازنہ دلچسپ ہے۔ انگلستان کے ہوائی جہاز ۱۵۰۰، فرانس کے ۲۳۰۰، اطالیہ کے ۵۵۰۰ جاپان کے ۲،۵۶۰ اور ترکی کے ۳۷۰ ہیں ؛

جرمنی اور روس کے متعلق صحیح معلوم نہیں۔ کوئی کہتا ہے جرمنی کے پاس ۵۰۰۰ ہوائی جہاز ہیں، کوئی کہتا ہے ۱۰۰۰۰ روس کے پاس ۵۰۰۰ ہیں، اور کہا جاتا ہے۔ کہ یہ جلد ۱۲۰۰۰ ہو جائیں گے، ہوائی طاقت کی اہمیت اتنی ہے کہ اس کے متعلق گپ اڑانے سے بھی غنیم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔ ہوائی سفر اس قدر عام اور ہر دلعزیز ہو رہا ہے۔ کہ اس وقت دنیا کی ہوائی سڑکوں کا مجموعی طول ۲،۷۸،۲۰۰ میل ہے ؛

قوموں کی تنظیم کا چند لفظوں میں کیا ذکر ہو۔ دنیائے حاضر تنظیم کا ایک وسیع کارخانہ ہے، سیاست، جنگ، تجارت، تعلیم، تربیت، انسانی زندگی کا ہر شعبہ اب منظم ہے، تو کارآمد اور زندہ ہے، غیر منظم ہے تو محض مُردہ، اور بےکار ہے، روس امریکہ، جرمنی، اطالیہ، جاپان، یہ تنظیم کی روشن مثالیں ہیں۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں نیک کام مفید کام ترقی، شرارت سب منظم ہو کر رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ٹھیک ہو رہا ہے، قابل غور امر یہ ہے۔ کہ یہ وہ راہیں ہیں۔ جن کے ذریعے سے دنیائے حاضر کی زندگی مصروف عمل ہے ؛

بشیر احمد

حضرت خلیقی و حضرت اصغر کا انتقال

ہمیں یہ معلوم ہو کر بہت صدمہ ہوا ہے کہ "ہمایوں" کے قدیم مضمون نگار اور اُردو کے مشہور ادیب حضرت خلیقی دہلوی ۲۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو انتقال فرما گئے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت اصغر گونڈوی کے انتقال کی افسوسناک اطلاع بھی ملی ہے جن کے گراں پایہ اشعار وقتاً فوقتاً "ہمایوں" میں چھپتے رہے ہیں۔

اس غم میں ہم ان دونوں بزرگوں کے متعلقین کے ساتھ شریک ہیں۔ خدا ان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سرمایہ داری

دولت نے کیسی شورش اٹھائی

کیا بادشاہی اور کیا گدائی !

بھوکوں کی روٹی ہتھیا کے بندہ

کرتا ہے بندوں پر کیوں خدائی ؟

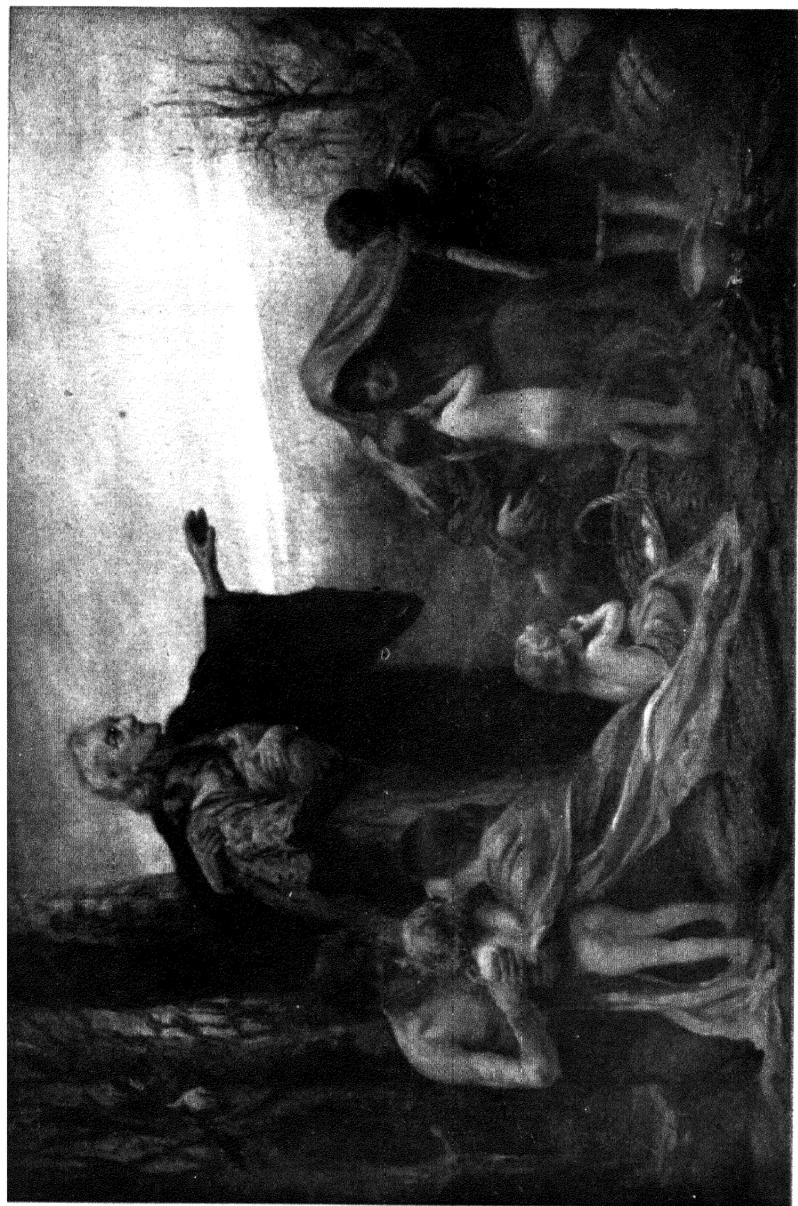
شاہی ، گدائی ، میری ، فقیری ،

جب اُٹھ گئے یہ پردے ریائی (ق)

یہ بھی ہے انساں وہ بھی ہے انساں

وُہ اِس کا بھائی، یہ اُس کا بھائی

حامد علی خاں



تجزیۂ نفس

"اپنے آپ کو پہچان"

"تجزیۂ نفس" کے معنی عام فہم زبان میں میں دل کی چھان بین۔

خود آگاہی کی اہمیت مسلّم ہے۔ جو انسان اپنے آپ سے واقف نہیں وہ زندگی کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا اور جو اپنی فطرت سے آگاہ ہو گیا جس نے اپنی قوتوں کے صحیح استعمال کی راہ دیکھ لی وہ گویا زندگی کی عظیم الشان شاہراہ پر لگ گیا اس کے لئے دنیا کی تمام مشکلیں آسان ہو گئیں:

"خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر"

پیغمبر اسلام کا قول ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ! (جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے یقیناً اپنے خدا کو پہچان لیا)۔

لیکن اپنے آپ کو جاننا کچھ آسان نہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جو شے ہمارے زیادہ قریب ہو ہم اتنے ہی گویا اُس سے بعید ہوتے ہیں۔ ایک اونچے پہاڑ کے عین نیچے کھڑے ہو کر ہم اُس کی بلندی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ چراغ تلے اندھیرا مشہور ہے آنکھ دور دور کی چیزیں دیکھ لیتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔ یہی انسان اور اُس کے نفس کی حالت ہے۔ آج کل کا مشہور

اس مضمون میں علاوہ متفرق ماخذوں کے خصوصیت کے ساتھ مفصلہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

1. Introductory Lectures (Freud), 2. Modern man in search of a soul (Jung) 3. What life should mean to you (Adler), 4. Conditions of Nervous Anxiety and their treatment (steakel), 5. Psycho-analysis and social Psychology (Macdaugal), 6. Psycho-Analysis, Its history, theory and practise - (TRIDON) 7. Psycho-Analysis and its Derivatives (Crichton Miller) 8. The man in the street and the New Psychology (Howden) 9. Self-mastery through (دیکھو حاشیہ صفحہ ۲۶)

نفسیاتی فلسفی ژُنگ کہتا ہے" چونکہ نفس ہم سے اِس قدر قریب ہے۔ بس اسی لئے نفسیات کا علم اس قدر دیر میں جا کر دریافت ہوا ہے"

اہلِ مشرق نے صدیوں اپنی باطنی فطرت کا مطالعہ کیا۔ مذہب، یوگ، تصوف، مختلف قسم کے نفسی وروحانی استغراق کے طریقے یہ سب اسی باطنی تجربے کے اظہار تھے لیکن خلوص وعمل کی روح سے عاری ہوتے گئے اور آخیر میں نقط خالی لفافے ہو کر رہ گئے

پھر انسانی ترقی کی باگ ڈور اہلِ مغرب کے ہاتھ آ گئی۔ اُن کی زندگی میں عمل کی رَو دوڑی۔ اُنھوں نے علوم وفنون کو ایک عملی راہ پر لگایا، طبیعیات کے ذریعے سے انھوں نے خارجی دُنیا کو زیرنگیں کیا۔ یوں انیسویں صدی میں مادیت کا زور رہا لیکن اُس کے اخیر میں بتدریج ایک ذہنی تبدیلی رُونما ہونے لگی۔ مغرب نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اُس کی زندگی میں کوئی کمی ہے، شاید یہ مادہ پرستی کا ردِعمل تھا، متمدن انسان کو اپنے اندر ایک بے چینی سی، ایک تشویش سی محسوس ہوئی۔ اُسے بہت کچھ حاصل تھا لیکن اِس پر بھی اُس کا اندرونی اضطراب بجائے گھٹنے کے روز بروز بڑھ رہا تھا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟ مغربی لوگ بیرونی دُنیا کی بہت خاک چھان چکے تھے، سو اب اُن کے ایک گروہ نے خارجی دُنیا کی تفتیش چھوڑ کر اپنے باطن کی تفتیش شروع کی۔ ان نئے علوم میں جو یوں پیدا ہوئے یقیناً سب سے اہم تجزیۂ نفس ہے: اپنے نفس کی چھان!

ایک علم النفس پہلے سے موجود تھا جس کا مقصد تھا انسان کے چلن کا مطالعہ لیکن یہ محض ایک نظری علم تھا۔ تجزیۂ نفس نے ایک عملی صورت اختیار کی، اس نے انسان کی داخلی حالت کا خارجی اشیاء کی طرح مطالعہ کیا اور اُس پر عملاً تجربے کئے۔ پہلے ماہرین نفسیات سمجھتے آئے تھے کہ سیرت قوتِ ارادی سے بنتی ہے۔ ارادہ کرو اور اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہو تو تم جیسا بھی اپنے آپ کو بنانا چاہتے ہو بن جاؤ گے۔ لیکن تجزیۂ نفس نے آکر یہ سارا طریق خیال بدل دیا۔ اُس نے کہا کہ سیرت محض قوتِ ارادی سے نہیں بنتی۔ محض اپنے آپ پر چابک لے کر سوار ہو جانے سے ہم اپنے آپ کو سیدھی راہ پر نہیں لگا سکتے بلکہ اس سے ڈر ہے کہ ہمارا مرکب جھنجھلا کر اور رستے سے الگ ہو کر کسی گڑھے میں خود بھی گر جائے گا اور ہمیں بھی گرا دے گا۔ نہیں یہاں تشدد کی بجائے عدمِ تشدد کی ضرورت ہے ایک دوسرے کے سمجھنے کی سمجھوتے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے آپ پر ظلم نہیں کر سکتے اور کریں گے تو بھریں گے۔

جس طرح مادے کا، مادے کی ہر چیز کا ایک قانون ہے اسی طرح انسان کے نفس کا، اُس نفس کے ہر خیال کا بھی ایک قانون ہے جو اسے دریافت کرنا اور سمجھنا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر بیرونی حالات ہمارے اختیار میں نہیں تو کم از کم ہمارے اندرونی خیالات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) Psycho-analysis (Hogarth), 10. The Recovery of Truth (Keyserling), 11. Autobiography (Freud) علاوہ بریں تجزیۂ نفس کے بارے میں وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں ڈاکٹر بلدیو شرما اور میاں عبدالعزیز صاحب (فلک پیما) سے دلچسپ اور سبق آموز گفتگوئیں ہوتی رہیں۔ (ب)

قطعاً ہمارے بس میں ہیں۔ ہم جس طرح جس طرف چاہیں اُنہیں موڑیں لیکن یہ غلط ہے، اگر ہم اپنے خیالات کا لحاظ نہ کریں گے تو وہ بھی ہمارا لحاظ نہ کریں گے اگر ہم اُن کو دبا دیں گے تو وہ بھی ہم کو چین نہ لینے دیں گے۔

زندگی کے متعلق لوگوں کے مختلف خیال ہیں۔ بعض سمجھتے ہیں کہ معاشری اسباب اہم ترین ہیں اور زندگی محنت اور معاشری قواعد کی پابندی سے بنتی ہے۔ بعض سمجھتے ہیں کہ آسمانی اسباب اہم ترین ہیں اور زندگی قسمت اور قضا و قدر سے بنتی بگڑتی ہے۔ حقیقت کچھ ہو دو اور باتیں بھی قابلِ غور اور لائق اعتنا ہیں ایک یہ کہ صحیح زندگی کی مضبوط ترین بنیاد انسان کی فطرت و جبلت ہے جو ہے جو کچھ کہ وہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ انسان ایک حد تک اپنی زندگی میں صاحبِ اختیار ہے یعنی ہماری بنیاد جبر پر قائم ہو مقدر ہی لیکن ہم اس اٹل بنیاد پر آزادانہ اپنی زندگی کی بالائی تعمیر تیار کر سکتے ہیں۔

بلاشبہ پہلے ہمیں اپنی جبلت کو جاننا اور ماننا ہے۔ زندگی خیالات سے بنتی ہے خیالات جن میں ایک یکسوئی ہو نفسی امن و امان لئے ہوئے جن میں ایک یک جہتی ہو سرگرم و فعال، اور ایسی یکسوئی اور یک جہتی اُس وقت تک پیدا نہ ہوں گی جب تک ہم اپنے اندرونی خیالات میں تطابق پیدا نہ کریں گے، جب تک ہم اُن اندرونی مناقشات کو جو ہمارے نفس میں برپا ہوتے ہیں دُور نہ کر دیں گے۔ ہمارے نفس میں اطمینان نہیں ہم اپنی جبلت کی بعض اہم ضروریات سے غافل ہیں، یا خواہ مخواہ اُن سے برسرِ پیکار رہتے ہیں اور اس کا لازم نتیجہ وہ باطنی کشمکش ہوتی ہے جو ہماری زندگی کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ہم اپنے نفس کی مناسب باتیں مان کر اُس کے ساتھ ایک باوقار خود دارانہ صلح کر لیں تاکہ زندگی کی خارجی جد و جہد میں ہم اطمینان اور عزم و ہمت سے آگے بڑھ سکیں۔ اپنے نفس کے آئین و قوانین کو سمجھیں۔ یہ اٹل ہیں۔ یہاں ہم با اختیار نہیں بلکہ وہ صاحبِ اختیار ہیں۔ بعض ماہرینِ تجزیہ یہیں تک رہ جاتے ہیں لیکن بعض دوسرے اس سے آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان محض ایک مجبور ہستی نہیں بلکہ اُسے بہت کچھ اختیار بھی حاصل ہے۔ ہمارا نفس مقید ہو لیکن ہماری رُوح آزاد ہے۔ یہ دونوں باتیں بظاہر ایک دوسرے کے متضاد ہیں لیکن غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ بقول تیصرلنگ زندگی نام ہے متضاد کیفیتوں کے نظم و نسق کا۔ نفس کے جبلی میلانات کچھ ہوتے ہیں دماغ کے رُوحانی تصورات کچھ اور۔ ان میں تطابق پیدا کرنا ان کی سفلی کشمکش کو ایک علوی کشمکش میں تبدیل کرنا اور کرتے رہنا یہی ہے خردمند انسان کا کام اور یہی صحیح زندگی ہے!

بہرحال تجزیۂ نفس کا تعلق سب سے پہلے ہمارے جبلی میلانات سے ہے۔ ہمیں سمجھنا ہے کہ وہ کیا ہیں؛ وہ ہمارے اندر کیونکر اپنا کام کرتے ہیں؛ کیسے اُن کی تسلی ہوتی ہے کیسے وہ اپنا فساد برپا کرتے ہیں اور ہم کس طرح اُن سے مفاہمت کر کے اپنی زندگی کو زیادہ شاندار بنا سکتے ہیں؛

تجزیۂ نفس ایک بالکل نیا علم ہے۔ ۱۸۹۵ء میں جب آسٹریا کے ایک ڈاکٹر نے وئینا میں اس کے متعلق اپنا پہلا لیکچر دیا

تو صرف تین شخص اس لکچر کو سننے کے لئے آئے۔ اُس وقت دنیا کو نہ اس نئے علم سے کچھ واقفیت تھی نہ اس کی پروا۔ لیکن پچھلے چالیس سالوں میں اس کی ترقی اور اشاعت نے بلاشبہ متمدن دنیا کی کایا پلٹ دی ہے۔ جیسے بیان کیا گیا ہے اس سے پہلے مغربی حکمت کے معنی دُنیا کی خارجی و مادی حیثیت اور انسان کی جسمانی کیفیات کا مشاہدہ و تجربہ تھا۔ اُس کے قوانین مادی قوانین تھے۔ اس حکمت کا ایک شعبہ طبابت اور عمل جراحی سے متعلق تھا۔ تجزیۂ نفس بھی انسانی صحت سے واسطہ رکھتا ہے۔ یہ اعصابی خرابیوں کے انسداد کا ایک طریقہ ہے اور ایک ایسا طریقہ جو حکمت کی سابقہ مقرر شدہ راہوں سے بالکل الگ تھلگ ہے اور بظاہر بالکل ان کے برعکس۔ لیکن اس علم کے مطابق اعصابی خرابیاں صرف وہی نہیں جو بظاہر بیمار اور عصبی اشخاص میں نظر آئیں اور انہیں مریض کا لقب دے دیں بلکہ وہ تمام چھپی ہوئی کیفیتیں بھی فی الحقیقت اعصابی خرابیاں ہیں جو انسان کو ناخوش یا کم ہمت یا بدمزاج یا ہٹیلا بنا کر خود اُسے دنیا میں ناکام یا اُن کے اکثر ہم جنسوں کو مصیبت میں مبتلا کردیتی ہیں۔ آج متمدن دُنیا کے اکثر باشندے ایسی ہی اعصابی خرابیوں کا شکار ہو رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ متمدن انسان بالعموم ایک ناخوش وجود ہے اور اُس کا تمدن انتہائی خطرے کی حالت میں ہے۔

تجزیۂ نفس کے ماہرین کا خیال ہے کہ تہذیبِ حاضر مصنوعی تفریقات اور غیر فطری بندشوں کی کمزور بنیاد پر قائم ہے اسی لئے اُس میں تشویش و اضطراب کی علامتیں جابجا نمودار ہیں۔ تجزیۂ نفس وہ علم ہے جو انسانی نفس کے چھپے اور دبے ہوئے خیالات و جذبات کی چھان بین کرتا ہے اور جس کا مقصد اس نفسی صفائی سے انسان کے نفس کی وہ صحت یابی ہے جس کے بغیر نہ وہ خود خوش رہ سکتا ہے نہ دوسروں کو خوش رکھ سکتا ہے اور نہ اپنے بنی نوع انسان کے لئے اُس حد تک سُودمند ثابت ہوسکتا ہے جس کی قدرتی طور پر اُس سے توقع ہونی چاہئے۔ جس طرح حکمت کی دوسری شاخوں نے اپنے مادی قوانین دریافت کئے اسی طرح تجزیۂ نفس نے اپنے نفسیاتی قوانین کو دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ جس طرح طبیعیات اور کیمیا نے مادے کے خواص سے بحث کی اور بتایا کہ دنیا کی تمام چیزیں خاص قوانین کے ماتحت اپنا کام کرتی ہیں اسی طرح تجزیۂ نفس نے واضح کیا کہ انسانی نفس بھی قانونِ علیت کی کارفرمائی کے تابع ہے اور انسان کا ہر خیال ایک خاص سبب کے ماتحت وجود میں آتا ہے، کوئی خیال محض اتفاقیہ طور پر دل میں نہیں اُٹھتا۔ ہمارے خیالات خواہ وہ معقول ہوں یا فضول سب کے سب ایک خاص سلسلے میں مربوط ہوتے ہیں، ہم اپنے خیالات میں جیسا کہ ہمارا خیال ہے کامل طور پر آزاد و خودمختار نہیں ہیں، اس لئے اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے خیالات پریشان نہ ہوں اور اپنے ساتھ ہمیں بھی پریشان نہ کریں تو ہمیں ان خیالات کی ماہیت اور طریقِ عمل کو سمجھنا چاہئے کہ یہ کیونکر پیدا ہوتے ہیں اور کس طرح بظاہر مٹ کر دراصل ہمارے دل کے اندر ہی اندر چھپے رہتے اور ہمیں مضطرب کئے رہتے ہیں۔ تجزیۂ نفس کے بانی مبانی فرائڈ کا قول ہے کہ ”ہم ہیں جو ہم ہیں اس لئے کہ ہم رہے ہیں جو ہم رہے ہیں اور جس شئے کی انسانی زندگی و محرکات کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے

ضرورت ہے وہ اخلاقی معیار یا اندازے نہیں ہیں بلکہ مزید علم ہے"۔

"اپنے آپ کو جان" یہ تھا سقراط کا قول اور یہی پرانا قول تجزیۂ نفس کے نئے علم کی بنیاد ہے۔ ہم ہر روز بیسیوں باتیں کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ فضول بے معنی اور قطعاً غیر اہم ہے لیکن تجزیۂ نفس معمولی واقعات کی اہمیت ثابت کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی بات بھی بے معنی اور فضول نہیں اور ہر شخص کے نفس کے لئے اس کی ایک بظاہر غیر اہم حرکت بھی بحقیقت نہایت درجہ اہم ہے۔ ایک بالغ ہوشمند آدمی اپنی انگلی کا سرا منہ میں ڈال کر اپنا ناخن دانتوں میں لے لیتا ہے یا کسی دوست کا دیا ہوا خط ڈاک میں ڈالنا بھول جاتا ہے یا کسی شخص کا نام اس کے ذہن سے اتر جاتا ہے یا وہ کسی سے کوئی چیز عاریتہً لے کر اسے واپس کرنا بھول جاتا ہے یا وہ ایک الٹ پٹ سا خواب دیکھتا ہے، وہ سمجھتا ہے اور لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ سب اس کی بے معنی سی حرکتیں ہیں جن کی طرف توجہ کرنی تضیع اوقات ہے لیکن نہیں تجزیۂ نفس کے ماہرین کی تحقیقات نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ یہ بظاہر معمولی باتیں ان حضرت ہوشمند کی زندگی کے نہایت اہم میلانات اور واقعات سے وابستہ ہیں اور اگر وہ صحیح معنوں میں ایک زندہ اور مفید ہستی بننا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ان کے عیب زدہ نفس کی اچھی طرح چھان بین کی جائے اور انہیں سیدھے رستے پر ڈالا جائے۔ جو شخص اپنی انگلی منہ میں ڈالتا ہے یا اپنا ناخن چباتا ہے وہ اصل میں اپنی شیر خوارگی کے وقت کو یاد کرتا ہے وہ ابھی اسی اولین زمانۂ عمر کی حرکتوں کا نرجب ہوتا ہے وہ سمجھنے والوں کے لئے اپنے بعض افعال میں ابھی ایک دودھ پیتا بچہ ہے یعنی ابھی اس کا دودھ چھڑایا نہیں گیا۔ جو شخص کسی کا دیا ہوا خط ڈاک میں ڈالنا بھول جاتا ہے وہ اگرچہ وعدہ کرتے وقت بظاہر نہایت شایستہ اور مہذب تھا لیکن دراصل وہ اس کام کو جو اس کی تہذیب نے اس کے سر تھوپ دیا۔ ایک بوجھ سمجھتا تھا اس لئے جب وہ پوسٹ بکس کے پاس سے ہو کر گزرا تو اس کے چھپے ہوئے خیال نے اپنا کام کیا اور اسے اس کا وعدہ بھلا دیا۔ جب ہم کسی سے کوئی چیز مانگ لیتے ہیں اور اسے واپس کرنا بھول جاتے ہیں تو حقیقت میں ہماری نیت اسے اپنے ہی پاس رکھ چھوڑنے کی ہوتی ہے ہمارا ضمیر لاکھ اسے واپس دینے کا اعلان کیا کرے ہمارا نفس امارہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور ہمارے ضمیر پر ایک پردہ سا ڈال دیتا ہے۔ اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ (عملوں کا انحصار نیتوں پر ہے) لیکن عموماً گو ظاہری طور پر ہمارے اعمال شاندار ہوتے ہیں ہماری نیتیں اتنی پسندیدہ نہیں ہوتیں۔ اس لحاظ سے کئی ظاہرہ طور پر نیک آدمی بلکہ کئی خلوت میں نیک کام کرنے والے بھی کئی علانیہ برے کام کرنے والوں سے کچھ زیادہ نیک نہیں ہوتے اور بعض حالتوں میں یقیناً زیادہ برے ہوتے ہیں۔

ہوگارتھ نے اپنی کتاب میں چند نہایت دلچسپ اتفاقات کی پرمعنی مثالیں دی ہیں۔ ایک نادار نوجوان نے ایک امیر بڑھیا عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا اور ان لفظوں میں اپنے دوستوں میں اس آنے والے واقعے کا اعلان کیا "میں مس فلاں کو دبانا۔۔ نہیں نہیں، میرا مطلب ہے بیاہنا چاہتا ہوں"۔ اس زبان کی لغزش پر اس کے سب دوست ہنس پڑے۔ اس سے

اُس کی اصلی نیت خود بخود ظاہر ہو گئی۔

اِس طرح ایک دوشیزہ نے اپنی ایک سہیلی کو جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی لکھا کہ "مجھے اُمید ہے تم خیریت سے ہو گی۔ اور بہت ناخوش"۔ یہ محض قلم کی ایک لغزش تھی لیکن اس سے اُس کے چھپے ہوئے حسد کا صاف پتہ چل گیا۔

ایک عمر رسیدہ شخص جو نقاشی کا ماہر تھا زرد رنگ کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی لیکن جب اُس کا تجزیۂ نفس کیا گیا تو پتہ چلا کہ اِس کا باعث دراصل اُس کے بچپن کا ایک واقعہ تھا (تجزیۂ نفس سے چھپے ہوئے خیالات کی اس طرح تفتیش کی جاتی ہے کہ کبھی مختلف واقعات سُن کر کسی خاص واقعہ سے پہلے زمانے کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور کبھی "تلازم خیالات" سے یعنی ایک خاص لفظ سے جو مختلف الفاظ یکے بعد دیگرے سُوجھتے ہیں اُن کے مربُوط سلسلے سے ایک بھُولے ہوئے واقعے تک پہنچ جاتے ہیں) چنانچہ ہمارے اس نقاش کے تجزیۂ نفس سے یہ معلوم ہُوا کہ جب وہ ابھی لڑکا تھا تو وہ ایک اپنے سے بڑے لڑکے کے ساتھ کھیلتے ایک مرغی خانے کی طرف جا نکلا جہاں چند انڈے پڑے ہوئے تھے۔ یہ گندے تھے۔ بڑے لڑکے کو جو شرارت سُوجھی تو اُس نے چھوٹے لڑکے پر یہ گندے انڈے پھینکنے شروع کئے۔ چھوٹا لڑکا سخت ڈر گیا اور جب وہ گھر پہنچا تو اُس کے زردی سے لت پت کپڑے دیکھ کر ماں نے اُسے سخت سزا دی۔ یہ تلخ تجربہ لڑکے کے دل کے اندر دب کر رہ گیا۔ ہم اپنے جس تجربے سے بیزار ہوں وہ ہم فطرتاً اپنے "غیر شعور نفس" میں چھپا کر دبا دیتے ہیں لیکن پھر ایسی بات گو ہم اُسے لاکھ بھُول جائیں فی الحقیقت کبھی بھُول نہیں سکتی اور مدت کے بعد اپنا رنگ لاتی ہے۔ اِس حادثے میں بھی ایسا ہی ہُوا "غیر شعوریہ" میں زرد رنگ کا سزا کے ساتھ گویا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔ سو زرد رنگ نفس شعوریہ کو بُرا معلوم ہونے لگا۔ ایسی حالتوں میں جب تک شعوریہ کو غیر شعوریہ کے اس تلازم اور اس فعل کی توجیہہ کا پُورا پُورا علم نہ ہو جائے وہ اپنی مصیبت سے رہائی نہیں پا سکتا لیکن جب وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے اور حقیقت اُس پر روشن ہو جائے تو وہ آزاد ہو کر جلد اپنا رویّہ بدل لیتا ہے۔

ایک شخص ہمیشہ اپنے گھر کو ایک ٹیڑھے لمبے رستے سے ہو کر جاتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایک خاص مکان کے پاس سے ہو کر گزرنا نہیں چاہتا۔ اُسے خود اِس کی وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن ہاں اُسے یہ یاد آیا کہ پہلی بار جب اُس نے سیدھے رستے سے جانا چھوڑا تھا تو اُس نے اس مکان کے دروازے کی مُٹھی پر ایک سیاہ بڑا کوٹ لٹکتے دیکھا تھا۔ "تلازم خیالات" کے ذریعے سے اُسے یاد دلایا گیا کہ بچپن کے دنوں میں وہ اپنے ایک بڑے بھائی سے جو اس طرح کا کوٹ پہنا کرتا تھا سخت نفرت رکھتا تھا۔ یہ بات بھُول چکی تھی اور یہ نفرت بھی دل کے اندر دبا دی گئی تھی لیکن اِس کا اظہار مدت بعد اس عجیب و غریب طریقے میں ہُوا۔

ایک شخص کسی کا نام بھُول گیا۔ یہ نام "پونڈ" (معنی تالاب) تھا۔ تجزیے سے بچپن کی ایک دبی ہوئی یاد ظاہر ہوئی۔ جب وہ لڑکا تھا تو اُس کا ایک کتا تھا جس سے اُسے بے حد محبت تھی۔ ایک روز اُس نے ایک تالاب میں ایک پتھر پھینکا تاکہ پانی کے

چھینٹوں سے کتے کو ڈرائے۔ بدقسمتی سے وہ پتھر کتے کو جا لگا، کتا زخم کھا کر تالاب میں گر پڑا اور ڈوب کر مر گیا۔ اس سانحے سے لڑکے کو انتہائی ندامت ہوئی اور وہ کئی دنوں تک سخت پریشان رہا۔ یہ افسوسناک واقعہ دل کے اندر دب گیا اور بھلا دیا گیا۔ لیکن برسوں بعد اس کے اثرات کا اظہار اس طرح ہوا کہ بڑے ہو کر اُسے پونڈ (تالاب) کے لفظ سے ایک جبلّی سی نفرت پیدا ہو گئی اور وہ نتیجتہً یہ نام جلد بھول گیا۔ اُس کا نفس اس واقعے سے اور اس لئے اس لفظ سے گریز کرتا تھا۔

ڈاکٹر ہنگلی اپنی ایک آپ بیتی یوں بیان کرتا ہے کہ "میرے شیر خوار بچے کا ہاضمہ خراب ہو گیا۔ جب یہ کچھ عرصہ ٹھیک نہ ہوا تو میری بیوی نے اور میں نے سوچا کہ بچے کی خوراک میں کیا کیا تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ چونکہ ہمیں اس کی وجہ معلوم نہ ہو سکی ہم نے اپنے ڈاکٹر کو بلایا۔ اُسے بھی کچھ پتہ نہ چلا لیکن جب وہ جانے لگا تو اتفاقاً میری بیوی کو یاد آ گیا کہ وہ بچے کو رسک (ایک قسم کے بسکٹ) دیتی رہی تھی۔ اس پر ڈاکٹر نے فوراً کہا، ظاہر ہے کہ بچہ انہیں بغیر اچھی طرح چبائے کھاتا رہا ہے۔ چنانچہ بعد میں بھی ایسا ہی ثابت ہوا"۔ اِس "بھول جانے" کا کیا سبب تھا؟ اس کا سبب یہ تھا کہ رسک ٹھوس بنی بنائی خوراک تھی اور بچے کو رسک کھلانے میں والدین کو وہ دقت پیش نہ آتی تھی جو دودھ کی بوتل بنانے میں پیش آتی تھی۔ سو اُن کی دلی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح ہاضمے کی خرابی کی وجہ رسک نہ ہو اور اس لئے رسک اُنہیں یاد نہ رہے۔ اُن کا آرام پسند غیر شعوری نفس اس فراموشی کا موجب بنا۔

برل امریکی تجزیہ کار نے ایک نوجوان کا قصہ لکھا ہے کہ اُس نے دو خاتونوں سے وعدہ کیا کہ وہ اُنہیں تھیئٹر میں ایک نیا تماشا موسوم بہ "الیاس جیمی ویلینٹائن" دکھانے لے جائے گا۔ یہ تماشا جرائم اور قانون شکنی سے متعلق تھا۔ موٹر میں سوار ہوتے وقت اُس نے شوفر سے کسی دوسرے تھیئٹر جانے کو کہہ دیا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک غلط جگہ آ گئے ہیں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اُس تماشے کو کبھی پھر دیکھ لیں گے اور اب اسی تھیئٹر کا تماشا دیکھیں گے۔ بظاہر اس واقعے کی تہ میں کوئی خاص بات پوشیدہ نہیں معلوم ہوتی لیکن اس غلطی کے تجزیہ سے ظاہر ہو گیا کہ نوجوان کے دل میں ایک نفسی مناقشہ تھا جو اس غلطی کا موجب ہوا۔ اُس کے نفس میں ارتکاب جرم کے بعض میلانات تھے (یہی وجہ تھی کہ اُس کا تجزیۂ نفس کیا جا رہا تھا) اور قدرتی طور پر ان میلانات کی وجہ سے وہ قانون کی گرفت سے خائف تھا۔ تماشے کا تعلق قید خانے کی زندگی سے تھا اور اس لئے وہ نہ چاہتا تھا کہ اُسے اُس کا قانونی خوف یاد دلایا جائے۔ ایک طرف اُس نے خواتین سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اُنہیں تماشا دکھائے گا لیکن دوسری طرف اُس کا نفس خود ایک ایسا تماشا دیکھنے سے گریز کرتا تھا۔ اس سے دل کے اندر ہی اندر ایک نفسی مجادلہ پیدا ہوا اور یہی مذکورہ بالا غلطی کا موجب ہوا۔

ایک شخص کو یہ عجیب و غریب شوق تھا کہ وہ سجاوٹ کا پرانا سامان جمع کیا کرتا تھا۔ انتخاب میں یہ خصوصیت ہوتی تھی کہ چیز پرانی ہو اور اُس کے بنانے والا مر چکا ہو۔ تجزیہ سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے اُسے بڑے بڑے بلوطی صندوقوں سے دلچسپی تھی۔

یہ صندوق دراصل کفنی صندوقوں کو یاد دلاتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس شخص کی زندگی میں ایک ایسا وقت آیا تھا جب یہ بہت غمزدہ اور اداس رہا کرتا تھا اور خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ تجزیہ کے بعد جب اُسے پُرانا سامان جمع کرنے اور خودکشی کرنے کا تعلق سمجھایا گیا تو اُس کا پُرانا سامان جمع کرنے کا شوق مٹ جاتا رہا۔

تجزیۂ نفس کا یہ خاصا ہے کہ جب موضوع یا مریض کے سامنے حقیقت آشکار ہوجاتی ہے تو اُس کی مخصوص عادت یا خبط یا مرض کا خودبخود ازالہ ہوجاتا ہے۔ علم کی روشنی توہمات اور منافقات کے اندھیرے کو اپنے نُور سے منور کردیتی ہے اور نفس میں صحیح قسم کا ربط وضبط پیدا ہوجاتا ہے۔

لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اِن واقعات پر نفسیاتی پہلو سے زیادہ روشنی ڈالیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم تجزیۂ نفس کی ابتدائی تاریخ مختصر طور پر بیان کردیں۔ جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے تجزیۂ نفس کے علم کا بانی آسٹریا کے دارالسلطنت وئینا کا ایک ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ ہے جس کے متعلق اُس کے ایک مخالف نقاد مشہور انگریز ماہر نفسیات میکڈوگل کی رائے ہے کہ ارسطو کے وقت سے لے کر آج تک کسی نے انسانی فطرت کو اس خوبی سے نہیں سمجھا جیسے فرائڈ نے۔ فرائڈ اس وقت دُنیا کے بڑے سے بڑے مشاہیر میں شمار ہوتا ہے اور تجزیۂ نفس کا نہ صرف نام آج مہذب دُنیا میں اکثر لوگوں کی زبان پر ہے بلکہ اُس کے اثرات بچے بچے کی زندگی میں نمایاں ہیں۔ جہاں خارجی طور پر جنگ عظیم نے دُنیا کے گوشے گوشے میں ایک انقلاب پیدا کردیا وہاں باطنی طور پر نفسیات اور تجزیۂ نفس کے نظریات نے انسانی نفس کے خیالات اور انسانوں کے باہمی تعلقات میں ایک تلاطم برپا کردیا ہے۔ نسوانی تحریکات، غریب طبقے کی بے چینی، بچوں اور نوجوانوں کی آزاد منشی، زن وشوہر کے تعلقات کی جدید صورتیں، اخلاق کا نیا نقطۂ نظر، تعلیم کے جدید نظریے، جنسیت کا نیا تصور اور انسانی افعال پر اُس کا حیرت انگیز اثر یہ سب زیادہ تر تجزیۂ نفس ہی کی تلقین کے نتائج ہیں۔ تاریخ میں بہت کم لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اپنی حینِ حیات ہی میں اپنے ہم جنسوں کی زندگیوں پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے جتنا فرائڈ نے۔

فرائڈ کی عمر اِس وقت ۸۰ سال ہے۔ ۱۸۸۰ء کے قریب جب یورپ میں نفس غیر شعوریہ کی طرف ڈاکٹروں کی توجہ مبذول ہوئی اور اسی زمانے میں فرانس میں ڈاکٹر شارکو اور برن ہائیم نے ہسٹریا کے مریضوں پر تنویم کے طریقے کا (جس سے مریض پر "اثرآفرینی" کے ذریعے سے مصنوعی نیند طاری کی جاتی ہے اور اُسے مختلف باتیں کہنے یا کرنے کو کہا جاتا ہے) کامیاب تجربہ کیا۔ تو فرائڈ نے اِن ماہرین کے ہاں تنویم کی عملی تعلیم حاصل کی۔

اِدھر وئینا میں ۱۸۸۰ء میں ایک ڈاکٹر برُوئر نامی کو ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ اُس کے ہاں ایک اکیس سال کی نوجوان عورت اپنے علاج کے لئے آئی۔ وہ ہسٹیریا میں مبتلا تھی۔ اُس کے دائیں بازو پر فالج گرا تھا، آنکھوں کی حرکت میں خرابی

تھی، وہ پانی نہ پی سکتی تھی، "غائب دلی" کا شکار تھی وغیرہ وغیرہ۔ یہ شکایات اُس وقت پہلے پہل نمودار ہوئی تھیں جب مریضہ اپنے باپ کی تیمارداری کر رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بے حد محبت رکھتی تھی اور وہ اس شدید علالت سے جانبر نہ ہو سکا تھا۔ بروئر نے تشخیص کی کہ مریضہ ہسٹیریا کا شکار ہے چنانچہ اُس نے بہت کوشش کی کہ نومیت کے ذریعے سے مرض کو دُور کر دے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ بروئر نے دیکھا کہ مریضہ اپنی "غائب دلی" میں چند عجیب وغریب الفاظ دہراتی ہے۔ اُس نے نومیت کی حالت میں بھی بار بار اُس سے یہ الفاظ دہرانے کو کہا۔ ان کا اشارہ اُن تصورات کی طرف تھا جو ایک نوجوان لڑکی کے دل میں اپنے علیل باپ کے بستر کے پاس رہ کر پیدا ہوتے ہیں۔ جب کبھی وہ ان خیالات کا اچھی طرح جی کھول کر اظہار کرتی اُس کی حالت کئی کئی گھنٹوں تک بہتر ہو جاتی لیکن تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی تاریک بادل چھا جاتے اور دوبارہ اُسی طرح نومیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا۔ ہاں ایک شکایت قطعاً دُور ہو گئی۔ اب وہ بآسانی پانی پینے لگی۔ نومیت کی حالت میں اُس نے یہ بھی بتایا کہ ایک انگریز خاتون سے جو گھر پر اُس کی تعلیم وتربیت پر متعین تھی اُسے سخت نفرت تھی، اُس کے کُتّے سے بھی اُسے نفرت تھی، ایک دن اُس نے اس کتے کو ایک گلاس میں پانی پیتے دیکھا۔ اس سے اُس کے دل میں سخت بیزاری پیدا ہوئی لیکن اُستانی کے لحاظ سے وہ خاموش رہی۔ نفرت کے اظہار کے بعد جب مریضہ کو ہوش آیا تو اُس نے بلاتامل پانی پی لیا۔ اُس کی آنکھوں کی خرابی کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔ وہ اپنے باپ کے بستر کے پاس بیٹھی تھی کہ فرطِ غم سے اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ایک لخت اُس کے باپ نے اُس سے وقت پوچھا، اُس نے آنسوؤں کو روکا اور چاہا کہ کسی طرح باپ کو اُن کا پتہ نہ چلے، سو گھڑی اُس نے آنکھوں کے بالکل قریب کر لی جس سے گھڑی کا ڈائل بڑا اور بگڑا ہؤا سا نظر آیا۔ اس کے بعد سبھی چیزیں اسی طرح نظر آنے لگیں۔ دائیں بازو کے فالج کی کہانی یہ ہے کہ ایک رات جب ویانا سے ایک ڈاکٹر کو اُس کے باپ پر عمل جرّاحی کرنے کے لئے آنا تھا تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھی بیٹھی تھک کر سو گئی اور اُس کا بازو کرسی کی پچھلی طرف لٹکا رہا۔ اس حالت میں اُس نے خواب میں دیکھا کہ ایک کالا سانپ دیوار میں سے نکل کر بستر کی طرف رینگ کر آ رہا ہے۔ اُس نے سانپ کو اپنے دائیں بازو سے ڈرانا چاہا لیکن اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا بازو شل ہو گیا ہے اور مطلق حرکت نہیں کر سکتا اور پھر دیکھا کہ اس کے ہاتھ کی اُنگلیاں چھوٹے چھوٹے سانپوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ دہشت کھا کر اُس نے دُعا مانگنے کی کوشش کی لیکن وہ انگریزی میں صرف چند بچوں کے گیت بُڑبُڑانے کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے بعد وہ فقط انگریزی ہی میں سوچنے اور بولنے لگی اور اپنی مادری زبان جرمن سے محض بے بہرہ ہو گئی۔ اب اُس دہشت ناک منظر کے بار بار دُہرانے سے اُس کی اصلی قوتِ تقریر پھر عود کر آئی اور کچھ دیر کے بعد اُس کا فالج اور دوسری تمام شکایات بھی قطعاً رفع ہو گئیں۔

نومیت کے ذریعے سے تفتیش کا یہ طریقہ جسے بروئر کی مریضہ نے باتونی علاج یا دُودکش کی صفائی کا نام دیا اور جسے بروئر نے "صفائی کا طریقہ" کہا سابقہ یعنی اثر آفرینی کے پُرانے طریقے سے بدرجہا بہتر تھا۔ بروئر نے اُس وقت اس عظیم الشان دریافت کی اہمیت

کو نہ سمجھا چنانچہ اُس نے اِس "باتونی علاج" کو فرائڈ کے وئینا واپس آنے تک چھوڑے رکھا۔ اُس کے بعد وہ اور فرائڈ مل کر یہ علاج کرتے رہے۔ اُنھوں نے تجربے سے دیکھا کہ مریض جب تک اپنے اظہارِ بیان میں غایت درجہ متاثر نہ ہو جائے وہ شفا نہیں پاتا۔ اس سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہر ایسی حالت میں جذبہ بند ہو کر کسی مرض کی علامت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی دیکھا کہ مریض عموماً زمانۂ علالت سے بہت پہلے کے واقعات دُہراتا ہے جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ہر علالت فی الحقیقت اِن ابتدائی بچپن کے واقعات سے وابستہ ہوتی ہے۔

بروئر اور فرائڈ جنسیت کے متعلق اختلاف رائے رکھنے کی وجہ سے جلد ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے لیکن فرائڈ نے ہمیشہ اپنے پرانے اُستاد کو عزت و احسان مندی کے الفاظ میں یاد کیا اور بہت سی اپنی اختراعات کو بھی اُس کی طرف منسوب کر دیا۔

۱۸۹۳ء میں فرائڈ نے اپنے ابتدائی تجربوں کے نتائج شائع کئے اور اسی سال میں اس نے نومیت کے ذریعے سے علاج کرنا ترک کر دیا۔ یہ طریقہ پُراسرار سا تھا اور بعض مریضوں پر کارگر بھی ثابت نہ ہوتا تھا لہٰذا فرائڈ نے فیصلہ کیا کہ اب وہ بغیر نومیت کے علاج کرے گا۔ اُس نے برن ہائیم سے یہ بات سیکھی تھی کہ نومیت والے مریض حالتِ نومیت کی باتیں یاد کر سکتے ہیں۔ اگر انہیں اس امر کا یقین دلایا جائے کہ اُنہیں یاد ہیں۔ فرائڈ نے اب اپنے مریضوں کے ساتھ یہی طریقہ برتنا شروع کیا۔ وہ بغیر نومی حالت کے محض اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں یقین دلاتا تھا کہ جو کچھ تم بھول رہے ہو وہ ضرور تمہیں یاد آ جائے گا۔ بعد میں اُس نے یہ ہاتھ رکھنا بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ مریض کو ہر قسم کی اناپ شناپ اور مہمل بے جوڑ باتیں کہنے اور کہے جانے کی ہدایت کرتا تھا کیونکہ اُسے یقین ہو چکا تھا کہ مریض کو وہی باتیں یاد آئیں گی اور ضرور آئیں گی جن کا تعلق نفسِ غیر شعوریہ کے اُس خاص مقام سے ہے جو مرض کا اصلی منبع ہے۔ جوں جوں یہ باتیں دُہرائی جاتی تھیں جی کی بھڑاس نکلتی تھی، نفسی کشمکش دُور ہوتی تھی اور مریض جلد صحت یاب ہو جاتا تھا۔

۱۸۹۵ء میں اُس نے اپنے ان خیالات کو لیکچروں کی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کیا۔ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے اُس کے ان لیکچروں میں حاضرین کی تعداد صرف تین پر مشتمل تھی اور وہ تین اشخاص ریڈ کر، آڈلر اور سٹیکل تھے۔ موخر الذکر دو اشخاص نے بعد میں فرائڈ سے علیحدہ ہو کر تجزیۂ نفس کے کام میں خاصی شہرت حاصل کی۔

اپنے مریضوں کے بعض عجیب و غریب خوابوں سے فرائڈ بہت متاثر ہوا اور جلد اس نتیجے پر پہنچا کہ خواب کی حقیقت اور اہمیت قابلِ غور ہے، اُسے ہماری ذہنی کشمکش سے گہرا تعلق ہوتا ہے، خواب اُس کے نزدیک ہمیشہ کسی خواہش کی تکمیل کا اظہار ہوتا ہے۔ عموماً اوائل عمر میں بعض خیالات نفس میں دبا دیئے جاتے ہیں وہ بظاہر بھول جاتے ہیں لیکن دراصل وہ مختلف طریقوں سے ہماری زندگی میں ظاہر یا اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کے اظہار کا ایک عام طریقہ خواب ہے۔ اس لئے کسی شخص کے خوابوں سے ہمیں اُس کی اندرونی خواہشوں اور کشمکشوں کا صحیح صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرائڈ نے اِس باب میں بڑی کاوش سے کام

نیا اور مغرب میں گویا ایک بالکل نئے علم کا اضافہ کر دیا۔ ایک ہزار سے زیادہ خوابوں کے سننے، اُن پر غور کرنے اور کامیاب طور پر اُن کی تعبیر کرنے کے بعد اُس نے اپنی عظیم الشان کتاب "خوابوں کی تعبیر" ۱۹۰۰ء میں شائع کی۔ اگر فرائڈ اور کوئی کام بھی نہ کرتا تو صرف تعبیرِ خواب ہی اُس کی شہرت کے لئے کافی ہوتی۔ فرائڈ نے حال میں کہا ہے کہ "ایسی بصیرت انسان کی قسمت میں زندگی بھر میں صرف ایک بار حاصل ہوتی ہے۔" وہ اپنی ۱۹۱۵-۱۹۱۷ء کی ابتدائی تقاریر میں لکھتا ہے کہ خوابوں کو قدیم زمانے میں مشرق میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ بادشاہوں کے درباروں میں اور اُن کی یلغاروں میں اُن کے ہمراہ ہمیشہ ایک تعبیر کرنے والا رہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے سکندرِ اعظم کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے کہ جب وہ ٹائر کے شہر کا محاصرہ کئے ہوئے تھا اور اس مہم میں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ سکندر محاصرے سے دست بردار ہونے پر تیار ہو گیا تو ایک رات اُس نے خواب میں دیکھا کہ ایک حیوان صورت اسپ نُما آدمی اُس کے سامنے خوشی میں ناچ رہا ہے۔ جب اُس نے یہ خواب اپنے تعبیر کرنے والوں کے سامنے بیان کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ یہ اُس کی فتح کی پیشین گوئی ہے۔ اس پر سکندر نے ٹائر پر ایک زبردست حملہ کرنے کا حکم دیا اور شہر فتح ہو گیا۔

جیسا کہ فرائڈ نے واضح کیا ہے خواب ایک نہایت پیچیدہ ذہنی مظہر ہے۔ بعض خواب سادہ اور آسان ہوتے ہیں، بعض بہت مشکل اور مبہم۔ آئندہ چل کر ہم خواب کی مختلف کیفیتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ خواب کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے جو ہماری بیداری کی زبان سے مختلف ہوتی ہے، اُس کی علامات و نشانات، اُس کے آدھا تیتر آدھا بٹیر ہونے کی خصوصیت، اُس کا اُلٹ پلٹ ہونا، اُس کے ظاہری خوف و تشویش میں بھی ایک قدیم "بھولی ہوئی" خواہش کی تکمیل یا سعیِ تکمیل، اُس کی صحیح یا غلط پیشین گوئیاں سب انتہا درجہ دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ضرورت ہمارے اس ابتدائی بیان میں اس بات پر یقین کرنے کی ہے کہ خواب ہمارے دبے ہوئے اور بھولے ہوئے خیالات عموماً ہمارے اوائل عمر کی خواہشات یا دوسرے اہم تجربات کا چھُپا چھُپا سا اظہار ہوتا ہے اور اُس سے اکثر ہمارے اندرونی ذہنی کوائف کا پتہ چل کر ہماری شخصیت اور اُس کے عقدوں پر خوب روشنی پڑتی ہے کہ ہم کیا ہیں اور کیا چاہتے ہیں اور ہمیں کس طرح اپنی زندگی میں اپنے حالات و خیالات میں وہ تطابق پیدا کرنا چاہئے جس سے ہم ایک زیادہ خرم، مضبوط، زندہ وجود بن سکیں۔

بچپن کے بھُولے بسرے خیالات کا ایک عجیب طریقے سے خواب بن کر عود کرنا ذیل کے خواب سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک نوجوان نے جو ایک امریکی تجزیہ کار کے پاس اپنے علاج کے لئے گیا۔ بیان کیا کہ میں نے ایک بھیانک سا خواب دیکھا ہے کہ ایک پنجرے میں ایک عورت سخت گھبراہٹ کی حالت میں بند ہے، اُس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ بڑے زور سے چلّا رہی ہے۔ تجزیہ کار نے تعبیر کے اُس طریق کے مطابق جسے "آزاد تلازم" کہتے ہیں یعنی ایک خیال سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور اسی طرح ابتدائی چھپے ہوئے خیالات کے کھوج نکالنے سے دریافت کیا کہ یہ اُس نوجوان کا ایک بچپن کا واقعہ ہے جس کا اُس پر گہرا اثر ہوا تھا اور جو سخت ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے نفسِ غیر شعوریہ میں چھپا پڑا رہا اور بھلایا نہ جا سکا۔ چیخنے چلّانے والی عورت نوجوان کی ماں تھی اور

وہ پنجرا حالتِ زچگی کی علامت تھی (ناپسندیدہ چیزیں بالخصوص جنسی کیفیتیں عموماً خواب میں مختلف عجیب و غریب لیکن معنی خیز علامات کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہیں) بعد میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ جب یہ نوجوان بچہ تھا تو وہ ایک بار غلطی سے اپنی ماں کے کمرے میں اُس کی زچگی کی حالت میں جا گھسا۔ اِس تجربے سے بچے کے دل پر دہشت چھا گئی اور اِس لئے اندر ہی اندر دب کر رہ گیا اور بیس برس بعد ایک بھیانک خواب کی صورت میں رُونما ہُوا۔

اسی طرح ڈاکٹر جونز نے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے جس کی عمر ۳۰ سال تھی خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی مختلف ہتھیاروں سے مسلح اُس پر حملہ کر رہا ہے۔ اُس شخص کا رنگ گندمی مائل ہے اور اُس کی سیاہ مونچھیں ہیں۔ دونوں آدمی آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور خواب بیں نے دوسرے کے بائیں ہاتھ کو زخمی کر دیا۔ خواب میں "چارلز" کا نام حملہ آور شخص سے متعلق معلوم ہوا لیکن نام کا ٹھیک پتہ نہ چلا۔ اِس کے بعد مسلح شخص یک لخت ایک خونخوار کتے میں تبدیل ہو گیا جو خواب بیں کو کاٹنے کو تھا کہ اس نے کتے کے جبڑوں میں اپنے ہاتھ ڈال کر اُنہیں چیر ڈالا اور اُس کے سر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ خواب بیں ایک امن پسند شخص تھا اور خواب محض فضول معلوم ہوتا تھا لیکن تجزیہ کار نے "ظاہری خواب" سے "آزاد تلازم" کے ذریعے سے اُس کے مخفی معنی نکالے۔ ڈاکٹر جونز نے مریض سے کہا کہ "چارلز" کے لفظ سے جو جو خیالات تمہارے دل میں اُٹھتے ہیں اُنہیں یکے بعد دیگرے بے تکلف بیان کرو۔ پہلے اُس نے چند اشخاص کا جن کا نام چارلز تھا اور جنہیں وہ جانتا تھا نام لیا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ خواب دیکھنے سے ایک روز پہلے وہ ایک دعوت میں شریک ہوا تھا جس میں وہ اپنے دوست ڈاکٹر چارلز سٹورٹ سے ملا تھا لیکن خواب والا حملہ آور ڈاکٹر سٹورٹ نہ ہو سکتا تھا کیونکر ڈاکٹر مذکور کی ڈاڑھی تھی۔ ہاں دعوت میں ایک اور شخص شریک تھا جس کی شکل حملہ آور سے خاصی ملتی جلتی تھی۔ "چارلز" کے لفظ سے دوسرا تعلق یا تلازم یہ معلوم ہوا کہ اِس سے خواب بیں کو انگلستان کے بادشاہ چارلز اول و دوم یاد آئے۔ اس کے بعد پھر اُسے اپنے دوست چارلز سٹورٹ کا نام یاد آیا۔ اور پھر انگلستان کے آمر کرامول کی مشہور پھبتی" وہ آدمی سٹورٹ " جو اُس نے انگلستان کے بادشاہ کنگ چارلز سٹورٹ اوّل کے متعلق کہی تھی یاد آئی۔ اِس سے خواب بیں کو فوراً یاد آ گیا کہ اُس کے والدین کا ایک طبی مشیر تھا جس کا نام "سٹورٹ سین کنگز" تھا۔ یہ ڈاکٹر جب خواب بیں ابھی نو سال کا تھا مر چکا تھا اس کے بعد خواب بیں کو اپنے اوائل عمر کا ایک واقعہ یاد آ گیا جو وہ قطعاً بھول چکا تھا کہ اُس ڈاکٹر نے ایک بار بڑے زور سے اُس کا نازک سا منہ کھول کر اُس کے دانت بڑی سختی سے ہلائے لیکن مُنہ کھولنے سے پہلے لڑکے نے ڈاکٹر کے بائیں ہاتھ پر کاٹ کھایا۔ دوسروں سے پوچھنے سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب وہ ابھی صرف پانچ برس کا بچہ تھا۔ اب اتنے عرصے کے بعد نفس غیر شعوریہ نے ڈاکٹر کی سخت گیری کا خواب میں یوں بدلہ لیا کہ اُسے ایک خونخوار کتے میں تبدیل کر کے اُس کے جبڑوں کو چیر ڈالا اور اُس کے سر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

اِس سے ہمیں بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ہم اپنی زندگی کے کئی واقعات بھول جاتے ہیں جو فی الحقیقت ہمیں یاد ہوتے

ہیں "ہم نہیں جانتے کہ ہم جانتے ہیں" - یہ واقعات عموماً پسندیدہ نہیں ہوتے لیکن ان کا ایک گہرا اثر ہمارے نفس پر ہوتا ہے۔ اسی لئے گو وہ بظاہر یاد نہیں رہتے لیکن نہ وہ بھولتے ہی ہیں - یہ دبے ہوئے خیالات موقع پاکر کبھی خوابوں میں اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کبھی مختلف عوارضات کی شکل میں اپنی خواہشات کی تکمیل یا نیم تکمیل ڈھونڈتے ہیں اور اس طرح ہم کو تنگ کرتے ہیں۔ ہم اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اس لئے وہ ہمیں متوجہ کرنے کے عجیب و غریب طریقے تلاش کر لیتے ہیں۔

ایسے ہی بند خیالات کا نتیجہ وہ بہت سے عجیب و غریب افعال ہیں جن سے تاریخ بھری پڑی ہے جن سے معمولی آدمی بعض اوقات غیر معمولی بن کر نظر آتے ہیں۔ نوعِ انسان کے جنگ و جدال کے بہادرانہ واقعات کی تہ میں عموماً افراد کے نفسی مجادلات مخفی ہوتے ہیں۔ ایثار اور ریاضتِ نفس اور گوشہ نشینی کے عقب میں عموماً چھپی ہوئی ناکام خواہشات کا کانٹا کھٹکتا ہے۔ پُرخلوص پیر پرستی کی بنیاد بھی عموماً جنسیت کا ایک چھپا ہوا جذبہ ہوتا ہے۔ شیخی خورے اور مغرور آدمی کی شیخی اور غرور کا اصلی باعث اُس کا یہ خبط ہوتا ہے کہ دُوسرے اُس کو تنگ کرنا اور ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے اس خبط کا علاج وہ یوں کرتا ہے کہ وہ اپنے تصوّر میں ایک بڑا آدمی بن بیٹھتا ہے۔

اِن تمام باتوں سے صاف واضح ہو گیا ہوگا کہ یہ خیال کہ انسان ایک خالص عقل پسند ہستی ہے اور اُس کے اعمال کے محرکات محض عقلی ہیں قطعاً غلط ہے۔ بلکہ انسان کے اکثر افعال اُس کی جبلّت اور فطری میلانات پر مبنی ہوتے ہیں۔ انسان میں بعض خواہشات اور ہیجانات مثلاً بھوک، جنسیت، خواہشِ حصُول ہیں جو قدرت نے اُس کی فطرت میں ودلیعت کئے ہیں۔ ان زبردست خواہشات و ہیجانات کو مختلف انسانی ادارے ایک حد تک جائز لیکن زیادہ تر ناجائز قرار دیتے ہیں اِس لئے اِن کو چھپایا اور دبایا اور بھُلایا جاتا ہے۔ نفسِ شعوریہ اِن کو نفسِ غیر شعوریہ میں گویا دفن کر دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ مُردہ ہو چکے لیکن اُن مُردوں کے حشر کا بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے جب ان کی ہستی گویا پھر نشر کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے یا عموماً یوں ہوتا ہے کہ یہ مُردے پڑے پڑے وہیں سڑتے گلتے رہتے ہیں اور ان کی عفونت سے ہوش مند باشعور ہستی کے خیالوں اور عملوں میں وقتاً فوقتاً خلل پیدا ہوتا رہتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتا، سمجھنا نہیں چاہتا کہ یہ خرابیاں اُسی کی اپنی کوتاہیوں کا نتیجہ ہیں۔

انسان اپنے تئیں اشرف المخلوقات تصوّر کرتا ہے۔ یہ محض خود فریبی ہے۔ انسان ایک حیوان ہے اور ابھی نہ صرف اُس کے جسم میں بلکہ اُس کے نفس کے چھپے ہوئے حصّے میں بھی اس حیوانی اصلیت کی سینکڑوں نشانیاں موجود ہیں۔ دُم سے تو انسان بے نیاز ہو گیا لیکن ابھی اُس کے اندر اندھی آنت یعنی اپینڈکس موجود ہے۔ وہ بظاہر نیک اور پاک اور بے غرض تو بن بیٹھا لیکن اُس کی جنسیت اور قوت طلبی اور خواہشِ حصُول اور خود پسندی ابھی تک اُس کے اندر کارفرما ہیں اور جتنا وہ اُن کو دبانے چھپانے اُتنا ہی وہ زیادہ شدومد سے چھپ چھپ کر رہ رہ کر کبھی کسی طرح اور کبھی کسی طرح اپنا کام کرتی ہیں۔ تجزیۂ نفس

کا سبق یہ ہے کہ تمدن کے بہت سے مظاہر فریب دہی ظاہرداری اور ریاکاری پر مبنی ہیں۔ انسان کی فطرت کچھ اور ہے اس کے دعوے کچھ اور۔ اور صحیح انفرادی و اجتماعی ترقی کا راز یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے انسانی فطرت اور انسانی اداروں میں تطابق پیدا کیا جائے۔

(باقی) بشیر احمد

اصطلاحات

تجزیہ نفس	Psycho-analysis	نفسی کشمکش / نفسی مجادلہ	Psychic Conflict
علم النفس	Psychology		
جبر	Determinism	نومیت	Hypnotism
جبلت	Instinct	اثر آفرینی	Suggestion
جبلی	Instinctual	دبے ہوئے خیالات / بند خیالات	Repressed Thoughts
قانونِ علیت	Law of causality		
میلانات	Inclinations / Dispositions	بندش۔ احتباس	Repression
		نشان	Symbols
نفسِ شعوریہ	Conscious mind	جنسیت	Sexuality
نفسِ غیر شعوریہ	Unconscious mind	ہیجانات	Impulses
تلازمِ خیالات	Association of ideas	اعصابیت	Neurosis
آزاد تلازم	Free Association	عصب زدہ	Neurotic

ہم نوجوان ہیں

اپنی زمین کے ہم آسمان ہیں
ہم وہ ہیں آپ ہی اپنا جہان ہیں
ہم نوجوان ہیں!

ب

آوازِ شاعر

میں زمیں پر مصحفِ احساس کی تفسیر ہوں　　عشق کی تنویر، خوابِ حُسن کی تعبیر ہوں
جود و عالم کی حدیں جکڑے ہو وہ زنجیر ہوں　　میں ستاروں کی زباں ہوں، چاندنی تقریر ہوں

میری نظمیں روشنی ہیں قلبِ حق آگاہ کی
یہ سنہری کنجیاں ہیں قصرِ مہر و ماہ کی

شہد میری گفتگو ہے سانس ہے میری گلاب　　نطق سے میرے نمایاں ہے تخیل کا شباب
پیکرِ خاکی ہوں لیکن وہ طلسمِ آب و تاب　　جس کے ہر ذرے میں گردش کر رہا ہے آفتاب

ڈالتا ہوں پرتوِ گلشن خس و خاشاک پر
عرش کی مُہریں لگاتا ہوں جبینِ خاک پر

وارثِ کونین ہوں، میرا کوئی ثانی نہیں　　میرے قدموں پہ جُھکی رہتی ہے فطرت کی جبیں
مسکراتی ہے غرورِ عرش پر میری زمیں　　ظالم و سرکش عناصر ہیں مرے زیرِ نگیں

رقص کرتا ہے نظامِ دہر میرے ساز پر
کاروانِ روح چلتا ہے مری آواز پر

ناز سے گلشن میں چلتی ہے ہوا میرے لئے　　جھوم کر آتی ہے ساون کی گھٹا میرے لئے

عزیز۔ ماسٹر صاحب کیا سب دریا پہاڑوں سے نکلتے ہیں؟
ماسٹر۔ بیشک۔
عزیز۔ اور کیا سب پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں؟
ماسٹر۔ قریباً سب بڑے برفانی پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں۔
عزیز۔ تو ماسٹر صاحب کوہِ الماس سے کونسا دریا نکلتا ہے؟
ماسٹر۔ کوہِ الماس! یہ تم نے کہاں پڑھا؟

میں سمجھا کہ ماسٹر صاحب میرے وسیع علم سے خوش ہوں گے بک بیٹھا۔

عزیز۔ ماسٹر صاحب میرے پاس ایک کتاب ہے اس میں کوہ الماس کا ذکر ہے۔ اس کے پیچھے الماس پری رہتی ہے اور اس کتاب میں کوہِ ندا بھی ہے جہاں حاتم طے گیا تھا اور کوہ قاف ہے جہاں آسمان پری رہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں ابھی اپنے غیر معمولی علم میں مسحور کچھ اور کہنے کو تھا کہ ماسٹر صاحب کے تھپڑ مکّوں کی موسلا دھار بارش نے میرا ناطقہ قطعی بند کر دیا۔ تھپڑوں سے تو صرف چوٹ لگی لیکن ماسٹر صاحب کے غیظ و غضب کے الفاظ یعنی" نالائق" "آوارہ" وغیرہ سے میرے دل کو ناقابلِ برداشت صدمہ ہوا۔ مجھے اس زمانے میں کیا پتا تھا کہ کتابوں میں جھوٹ بھی لکھا جاتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے اسی شام اباجان کو بھی خبر کر دی کہ یہ آوارہ لڑکا اپنی عمر بجائے سبق یاد کرنے کے فضول قصّوں کے پڑھنے میں صرف کرتا ہے۔ چنانچہ گھر میں بھی خوب ٹھکائی ہوئی دا ہیں بائیں گلوں پر، پیٹھ پر، سر پر جہاں کہیں جس جس کو رسید کا موقع ملا وہیں جما اور وہ تین چار کتابیں جو بڑے بھائیوں کی کتابوں سے چرا کر اس جانب بے فرصت کے وقت پڑھنے کے لئے رکھ لی تھیں سب ضبط ہو گئیں جب گل بکاؤلی والی کتاب بھی چھن گئی تو مجھے بے انتہا قلق ہوا مگر قسمت نے یہ یاوری ضرور کی کہ الماس پری والی کتاب پر ان لوگوں کی نظر نہ پڑی۔ پھر کیا تھا۔ پڑھتا رہا، بار بار پڑھتا رہا اور الماس پری کے ملک کا جغرافیہ میرے دل میں سماتا گیا۔

یہ ہے میری داستان۔ مجھے تسلیم ہے کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہے۔ ماسٹر صاحب نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے میرے فائدے کے لئے کیا۔ اس کی یہی لیاقت تھی کہ جو پڑھا ہے وہ پڑھا دے مگر خود کسی بات پر مطلقاً نہ سوچے۔ کئی سال ہوئے میں اس سعدی کے بیٹے کو اور اس جیسے چند ایک اور طفل کُش بُوموں کو صدق دل سے معاف کر چکا ہوں مگر اس کو کیا کروں کہ دل اس حالِ طفلی پر ایسا جما کہ آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتا۔

(۳)

سعدی صاحب! آپ شوق سے "چہل سال عمرِ عزیزت" کو رویا کیجئے۔ مجھے جس چہرے میں الماس پری کی جھلک

نظر آئے فوراً مزاجِ طفلی کی یاد کو تازہ کر لیتا ہوں۔

ہاں اور ابھی ذرا ٹھہریئے۔ سوا نَو سال کی شیخ صاحب آپ نے عمر پائی اور لاکھوں کروڑوں پر اپنی کتابوں کے ذریعہ سے تسلط جمائے بیٹھے ہو آؤ ایک دو منٹ ہمارے ساتھ کوہ الماس کی سیر کر لو۔ کیا ہوا جو آپ بھی آوارہ ہوئے۔

کوہ الماس کی سرزمین پر مٹی نہیں ہیرے ہیں۔ یہ اس لئے کہ پانی میلا نہ ہو۔ پنجاب کے دریاؤں میں علی الصباح جوق در جوق ہزاروں نہانے والے اور نہانے والیاں جاتی ہیں۔ دُھل دُھلا کر واپس آ جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا ہوں کہ ان مَیلے کچیلوں کو تو دریا نے دھو دیا دریا کو اب کون دھوئے گا؟ اسی لئے پنجاب کے جغرافیہ پر کوہ الماس کے جغرافیہ کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہاں پانی جیسی پاک چیز کے لئے ہیرے بچھے ہیں۔ چاندی کی لہریں ہیروں کی پیاس بجھاتی ہیں۔ پنجاب کے پانچ دریاؤں کی طرح نہیں کہ دریا کی قسمت میں مٹی، گوبر اور انسان۔

دُنیا بھر کی زبانوں میں پریزاد جیسے لفظ سے زیادہ پیارا کوئی لفظ نہیں۔ کوہِ الماس کی لطیف ہوا کے لئے دُھواں نہیں بلکہ پریزادوں کے نازک جسم۔ پنجاب کی ہوا میں میونسپل کمیٹیوں کی غفلت، ووٹوں کے طلبگاروں کا شور اور شکر کے کارخانوں کی سڑاند۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ وہ کوہ الماس جو میرے دماغ میں حالِ طفلی کی نہ مٹنے والی یادگار ہے مجھ سے کیسے چھُٹے۔ سچی بات یہ ہے کہ نفسیات کا یہ مسئلہ آپ کے زمانہ میں بڑے سے بڑے عالم کی سمجھ میں بھی مشکل سے آتا۔

ذکی الحس انسان واقعاتی دنیا سے تنگ آ کر اپنے لئے ایک خیالی دُنیا قائم کر لیتے ہیں اور زیادہ تر اسی میں رہتے ہیں۔ اب شاید آپ کی سمجھ میں آ جائے کہ جس ملک میں ہوا کثیف، پانی گدلا، دل میلے ہوں وہاں مجھ سا انسان اپنے لئے ایک ذہنی کوہ الماس مہیا نہ کرے تو زندہ کیسے رہے! آپ نے سات سو سال پہلے ہی دُور بین لگا کر میرے حالِ طفلی کا تمسخر اُڑا دیا لیکن قبلہ جو آپ نے اُن مسجدوں میں تعلیم پائی ہوتی جہاں آپ کی گلستاں بوستاں کی تدریس میں صغیر سن بچوں کی چمڑی اُترتی ہے جہاں مولوی ڈکاریں لیتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں تو آپ بھی ایک نہیں دس کوہ الماس عالمِ تصور میں قائم کر لیتے اور ان میں ایک نہیں سو ہنی سنوری الماس پری چھپا کر آباد کر لیتے۔

کاروبار والی دُنیا سے میرے اس بچپن کے گریز کو آپ نے

مزاج تو از حالِ طفلی نہ گشت

والی گالی دے کر دنیا کے سامنے غلط پیش کیا ہے اور چونکہ میری اور آپ کی اب قطعی بگڑ چکی ہے میں بھی دبی زبان سے آپ کی دو ایک باتیں کہہ ہی ڈالوں گا۔ یہ آپ ہی نے لکھا تھا نا کہ

پئے علم چوں شمع باید گداخت — کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

مجھے خوب یاد ہے کہ آپ کا یہ جھوٹ جھوٹ نہیں طوفان۔ ایک مشہور کتب خانہ میں آب زر سے لکھا ہوا نمایاں جگہ آویزاں ہے
عہدِ طفلی میں مجھ پر اس قطعہ کا برقی اثر ہوتا تھا۔ آپ ہی فرمائیے کہ دوسرے مصرع میں جو کلیہ آپ نے قائم کر دیا وہ کہاں تک
درست ہے؛ حضرت عیسےٰ کہاں کے عالم تھے؛ حضرت مریم نے کیا کتابیں تصنیف کی تھیں؛ اور کیا بہت بڑے بڑے
مشرک بہت بھاری بھاری عالم نہ تھے۔ منو کے علم کی سارے ہندوستان میں دھاک ہے۔ وہ کیا اپنے علم کے زور سے
موحد ہو گئے؛ یونان میں علم کا ڈنکا بہت زور سے بجا۔ وہاں خدا کے شناسندہ کتنے تھے؛ حضرت! زبان نہ کھلوائیے۔ صحیح کلیہ
صرف یہ ہے کہ خدا کو وہی جانتے ہیں جو کچھ بھی نہیں جانتے۔ یعنی بچے شاید جانتے ہوں اور آپ باایں ہمہ فضل و علم حالِ طفلی
سے برسرِ پرخاش ہیں۔

لگے ہاتھوں اپنی ایک مشہورِ آفاق نصیحت کا ماجرا بھی سُن لیجئے۔ وہ تو آپ کو یاد ہے نا کہ

یکے قطرہ از ابر باراں چکید . . . .

چو خود را بچشمِ حقارت بدید — صدف در کنارش بجاں پرورید

واللہ کیا سڑا بُسا فلسفہ آپ نے اس قطعہ میں پیش کیا ہے۔ یہ قطعہ بھی آب زر سے لکھا ہوا گھر گھر میں جھلکتا ہے۔ خدا کے بنائے
ہوئے انسانوں کو آپ اور یہ تعلیم دیں کہ اس خدائی کام کو حقارت سے دیکھے! آپ کی قسمت اچھی تھی کہ فردوسی آپ سے
پہلے ہی آغوشِ لحد میں سو گیا ورنہ جس طرح اس نے "چرخ گرداں" کو مخاطب کیا تھا اسی طرح "مصلح الدین" کو مخاطب کرتا۔
حضرت خلاصہ یہ ہے کہ اگر آپ کی تعلیم اس قدر غلط نہ ہوتی تو ہم آپ کے پڑھائے ہوئے اس قدر بیکار نہ ہوتے۔ میں خوب
سمجھتا ہوں کہ کسی بادشاہ کی حکومت بہت ہو تو چالیس پچاس سال ہوتی ہے اور وہ بھی حریفوں کی دستبرد سے ہر وقت محفوظ
نہیں رہتی۔ آپ کی حکومت سات سو سال سے ہے۔ بادشاہ کی حکومت محدود ہوتی ہے آپ کی حکومت اس سے کہیں زیادہ
وسیع ہے۔ سمرقندی تیمور نہیں، تیمور کیا کوئی چغتائیوں کا نام لینے والا باقی نہیں مگر سعدی کی گلستاں بوستاں اب تک سرسبز ہیں
سمرقند پر کیا موقوف ہے بخارا، طہران، بغداد، دہلی، ڈھاکہ، بیجاپور جہاں کہیں فارسی رہی وہاں صحیح معنوں میں خطبہ سعدی کے نام کا
پڑھا گیا۔ عالمِ اسلام کیا ساری دُنیا میں آج تک ایسی زبردست شخصیت کی مثال نہیں کہ تعلیم میں ایک شخص کی دو کتابیں قطعی طور پر
ضروری جزو ہوں۔ اس خیال کو آج تک کسی نے پیش نہیں کیا لیکن میری اس تحریر کو پڑھ کر لوگوں کو یقین آجائے گا کہ جو امتیاز زمانے
نے آپ کو بخشا ہے وہ آج تک کسی اور انسان کو نصیب ہی نہیں ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔

لیکن حضرت گستاخی معاف ہو تو ایک بات کہہ دوں۔ آپ نے دانائی اور دُور اندیشی پر اس قدر زور دیا کہ اب مسلمان پیدا
ہی دانا ہوتے ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں میں تو آپ کی بدولت یہ حالت ہے کہ آٹھ کروڑ لیڈروں میں آٹھ کروڑ ہی اپنے

آپ کو چشمِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور علم کے شوق میں بالکل ہی گھل گئے ہیں، ان پر ہرگز آپ کا یہ فقرہ چسپاں نہیں ہوتا کہ

مزاجِ تو از حالِ طفلی نہ گشت

لیکن اجازت ہو تو یہ عرض کروں کہ اب بے انتہا ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے ہاں دانا قدرے کم پیدا ہوں اور حالِ طفلی کے متوالے متعدد نظر آئیں۔ یقین کیجئے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں اگر آپ کی تعلیم جاری رہی اور حالِ طفلی یونہی آپ کی وجہ سے بدنام رہا تو خاتمہ بالخیر ہے۔ انسان کا پہلا، آخری اور تمام تر فرض یہ ہے کہ اپنے اندر ایک ایسی زبردست خوبصورت دنیا قائم کر دے کہ کوئی اسے مٹا نہ سکے، ایسی دنیا جو مسرتوں سے بھری ہو اور دانائی سے بے نیاز ہو۔ یہ قائم و دائم ہو تو بیرونی زندگی کا رنگ بھی خوشنما ہونے لگتا ہے۔

(۴)

جو سوسائٹیاں سعدی زدہ نہیں کس قدر بارونق ہیں۔ کیا کیا کام ان لوگوں نے نہیں کر ڈالے۔ مجھے یقین ہے کہ غازی پاشا جس کا تازہ ترین نام آتاترک ہے گلستاں بوستاں نہیں پڑھا تھا ورنہ دانائی کے بوجھ سے اس قدر دب جاتا کہ کچھ بھی نہ کر پاتا۔ مصیبت یہ ہے کہ مسلمان صرف دانا ہی نہیں پیدا ہوتے بلکہ کئی صدیوں سے بوڑھے پیدا ہو رہے ہیں۔ جوانی کی حماقتوں کی اُمنگ ہی باقی نہیں مگر یہ دلچسپ قصہ فے الحال نہیں سناتا۔ صرف یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ اگر کہیں میری طرح اور بھی ایسے ہیں (اور ضرور ہوں گے) جو ماسٹروں سے پٹ پٹا کر بھی حالِ طفلی میں محصور ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ شیخ سعدی کے رعب میں آکر خواہ مخواہ اپنے آپ سے متنفر ہوں سجدۂ شکر ادا کریں کہ بچ گئے اور میرے ساتھ مل کر یہ کہیں ع

"الوداع اے شیخ سعدی الوداع"

رمضان جائے تو عید آئے، سعدی جائے تو جوانی آجائے۔

فلک پیما

اُردو

"اپنی زبان کی خوبیاں وہی سمجھ سکتا ہے جو اپنی زبان کو دُنیا بھر کی زبانوں سے اچھا سمجھے۔"

(خان بہادر میر ناصر علی مرحوم)

"کتنی پیاری زبان ہے اُردو یہ ہماری زبان ہے پیارے!"

حفیظ ہوشیار پوری

بڑے آدمی

ایک حمّام میں سب ننگے یہ اپنی ہے مثل
ایک حالت میں ہیں عام آدمی ہوں یا سردار
اُن کے سر سینکڑوں تو ان کے ہزاروں لاکھوں
قرض کے بوجھ سے ہر ایک کی حالت ہے نزار
رہن ہے جھونپڑی اس کی تو محل اُس کا بھی
اُس کی جُوتی تو فٹن اس کی بھی آئی ہے اُدھار
دین داری بھی بڑے آدمیوں کی ہے بڑی
گھاؤ تکلے کا ہے مُرغی کو اجل کا آزار

برجموہن دتاتریا کیفی دہلوی



راج ہنس

مکالمۂ جسم و جان

تن نے اک دن، جان سے کی گفتگو — رات دن ہے مجھ کو تیری جستجو،
تیری خاموشی سے میں خاموش ہوں — حکم پر تیرے سراپا گوش ہوں
میں، مسرت سے تری مسرور ہوں — رنج و غم سے تیرے میں رنجور ہوں
تو اگر گم ہے، تو میں معدوم ہوں — میں ترے ہر حکم کا محکوم ہوں
اس قدر جب مجھ کو تجھ سے ربط ہے — اس قدر جب اتحاد و ضبط ہے
تو مری آنکھوں سے کیوں مستور ہے — میری جاں! یہ کونسا دستور ہے
کہہ دے چپکے سے ذرا، اے میری جاں — تو ہے کس جا؛ اور رہتی ہے کہاں؛

مسکرا کر جان نے تن سے کہا — کیا بتاؤں میں تجھے اپنا پتا
ہوں تری رگ رگ میں اے تن دل نشیں — ہر جگہ ہوں اور نہیں ہوں پھر کہیں
کیوں تجسس میں مرے حیراں ہے تو — دیکھ اپنے کو، کہ عینِ جاں ہے تو
تو ہی تو میرا وطن ہے، میرے تن! — تو ہی ہے میرے تخیّل کا چمن
میرے مخفی راز کا مظہر ہے تو — میں دمِ خنجر ہوں اور خنجر ہے تو
قلب تیرا، میری خلوت گاہ ہے — میری جلوت چشمِ حق آگاہ ہے
صورتم مخفی ست در نورِ نظر — بنگر اندر چشمِ خود، اے بے بصر!
گود میں تیری ہے سرمایہ ترا — ہیں ترے انفاس، گہوارہ مرا
تیری صورت ہے، فقط مورت مری — میری صورت، صرف طاقت ہے مری
بندہ از رب، رب ز بندہ، دور نیست — تن ز جان و جاں ز تن مستور نیست
تیری بے علمی ہی وجہِ فصل ہے — ورنہ مجھ میں، تجھ میں ہر دم وصل ہے

میرا جلوہ، کس جگہ مستور ہے؛
مادی آنکھوں میں بھی تو نور ہے۔

امجد حیدرآباد دکن



سیاہی اور سفیدی

جہلم میں ناؤ پر

گاٹیالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا، لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور تمازتِ آفتاب نے اور بھی حبس پیدا کر دیا تھا۔ میں درمیانے درجے میں بیٹھا ہوا تھا (اب لاری والوں نے بھی ریلوے کی طرح مختلف درجے بنا دیئے ہیں) اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا کہ کوئی موٹر نہ ملی ورنہ راستہ آسانی سے طے ہو جاتا۔ یوں بھی تمام لاری میں دلبستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ میرے دائیں طرف مور کی طرح طرّہ پھیلائے ہوئے ایک تھانیدار صاحب تشریف فرما تھے جو بار بار مونچھوں کو تاؤ دیئے جاتے تھے، سب سے آگے اوّل درجے کی نشست پر یعنی ڈرائیور کے بالکل قریب ایک تحصیلدار صاحب جلوہ افروز تھے جن کی خنداں پیشانی اور ڈھیلے صافے سے اُن کی دلی طمانیت کا اظہار ہوتا تھا۔ میرے سامنے کی نشست پر چار عورتیں بیٹھی تھیں، دو بالکل بوڑھی اور دو ادھیڑ عمر کی تھیں، مگر جو عورت میرے بالکل مقابل بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچّے کو لئے تھی وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور زیادہ بدصورت تھی، وہ کبھی کبھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی ایک حسین کی تلاش میں ہے۔ یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں میں جچ گیا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا۔ میں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور لاری کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر، آہ، اس مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں جو اپنی زندگی کی منزل پر بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی مجھے کہیں بھی رومان نظر نہ آیا، دل برداشتہ چہرے تھے اور حُقّے، یا پھر تھانیدار صاحب کا مورچھل، میں نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں کہا اس لاری میں سب کچھ ہے مگر حُسن ناپید ہے، دوسرے لمحہ میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کم عمر بدصورت عورت اپنے چھوٹے بچّے پر جھکی ہوئی اُسے نہایت مدھم آواز میں میری گود میں چلے جانے کو کہہ رہی تھی۔

اُس نے اپنی سانولی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھ کر گھٹے ہوئے لہجہ میں کہا "آہ! میں کس قدر تھک گئی ہوں، میرا سانس گھٹا جاتا ہے۔"

بیچاری غریب عورت! میرا یہ مطلب ہے کہ گو وہ ریشم میں ملبوس تھی اور بے حد بدصورت تھی۔ پھر بھی ہر عورت فطرۃً غریب اور کمزور ہوتی ہے، چنانچہ میں نے چھوٹے بچّے کو اپنی رانوں پر لے لیا۔

عورت نے احسان مند نگاہوں سے میری طرف دیکھا، پھر کھڑکی سے سر باہر نکال کر قے کرنے لگی۔

عشق کی مجبوریاں، ناچاریاں، ہیں نے جلدی سے ننھے کو تحصیلدار صاحب کی آغوش میں دھکیل دیا۔ اور خود اُٹھ کر ڈرائیور کو لاری ٹھہرانے کے لئے کہا۔

ڈرائیور بولا، سرکار، یہاں لاری ٹھہرانے سے کیا فائدہ بس گاٹیالیاں کا گھاٹ کوئی میل پون میل رہ گیا ہے، وہیں ٹھہراؤں گا کسٹم کی چوکی پر، دریا کے کنارے، دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے ان کی طبیعت راس ہو جائے گی۔

چنانچہ یہی ہوا۔

گاٹیالیاں اور شہر جہلم کے درمیان دریائے جہلم بہتا ہے۔ اس لئے شہر جہلم کو جانے کے لئے گاٹیالیاں سے کشتیوں پر سوار ہو کر دریا کو عبور کرنا پڑتا ہے، گاٹیالیاں کی چونگی پر عموماً ہر وقت بہت بھیڑ سی لگی رہتی ہے، ریاست جموں کو جاتے ہوئے مسافروں کا تانتا، ریاست جموں سے جہلم آئے ہوئے لوگ، اسباب سے لدے ہوئے بیل یا گدھے۔ چونگی پر ٹھہری ہوئیں بیشمار لاریاں اور دریا کے کنارے بندھے ہوئے لمبے لمبے مچھوے، ایک چھوٹی سی بندگاہ کا نظارہ پیش کرتے ہیں، اسی بھیڑ بھاڑ میں میں نے تحصیلدار صاحب، تحصیلدار صاحب اور کم عمر بدصورت عورت کو بھی کھو دیا، میرا اسباب مختصر سا تھا۔ اس لئے چنگی والوں سے جلد خلاصی کرالی اور ایک چھوٹے سے قلی پر اسباب لاد کر میں دریا کی سمت چلا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا گاٹیالیاں تک سفر نہایت تکلیف دہ رہا، سر میں درد بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن اب جوں جوں دریا کے وسیع پانیوں سے ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے آنے لگے طبیعت صاف ہوتی گئی، اور جب دریا کے کنارے پہنچا ہوں تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی نہا کر اُٹھا ہوں، لمبی لمبی دریائی گھاس میں جو کنارے پر اُگی ہوئی تھی ایک لطیف خوشبو تھی، جس نے بے حس نتھنوں کو بیدار کر دیا، جہاں تک نظر کام کرتی تھی پانی ہی پانی نظر آتا تھا جس پر چلتے ہوئے بڑے بڑے مچھوے اور چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ملاحوں کی پرشور راگنیاں، اور لمبی لمبی ڈانڈوں کے پانی کو چیرنے کی مدھم آوازیں ایک پُرکیف منظر پیش کر رہی تھیں۔

چھوٹے سے دُبلے پتلے قلی نے کاؤ کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے میرا اسباب اُتار کر رکھا، اُسی درخت کی چھدری چھدری چھاؤں میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بہت سا اسباب لئے بیٹھے تھے، غالباً کشتی کا انتظار کر رہے تھے میں نے قلی کو جیب سے دونی نکال کر دی، اور اُس سے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے؟

"عبداللہ"۔

"تو عبداللہ، ہمیں کہیں سے کشتی کا انتظام کر دو۔ دیکھو؛ ضرور۔

عبداللہ مسکرا کر کہنے لگا "صاحب ایک کشتی تو میری اپنی ہی ہے، ٹھہریئے، میں اپنے چھوٹے بھائی کو بلاتا ہوں ہم دونوں آپ کو پار لے چلیں گے، ساڑھے تین روپلے کرایہ ہوگا"

جب عبداللہ چلا گیا، تو میں نے زمین پر بیٹھ کر ادھر اُدھر دیکھا، ریت کے بڑے بڑے ٹیلے، کاؤ اور لبستگ کے درختوں کے جھنڈ، اُڑتے ہوئے ماہی خور۔ پھر میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف توجہ کی، لڑکی بیٹھ موڑے، دریا کی طرف مُنہ کئے بیٹھی تھی۔ اُس نے ایک گہرے رنگ کی سبز ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا کنارا سنہری تھا۔ لڑکا میری طرف دیکھ رہا تھا، اُس نے بھورے رنگ کا کوٹ اور ایک خاکی نکر پہن رکھی تھی، گلے میں ایک خوشرنگ ٹائی بھی تھی۔ مجھے اپنی طرف مڑتے دیکھ کر کہنے لگا۔ آپ کہاں جارہے ہیں؟

"جہلم کے پار ایک گاؤں ہے، وہاں میرا گھر ہے۔ بس وہیں جارہا ہوں۔ اور آپ؟" میں نے مستفسرانہ نگاہوں سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکے نے جواب دیا "ہم لاہور جارہے ہیں۔ میں تو جموں میں تعلیم پاتا ہوں، مگر یہ ـــ میری ہمشیرہ ہیں، لاہور ایف۔ اے میں تعلیم پاتی ہیں، انہیں پہنچانے جارہا ہوں۔ اس سفر میں بہت پریشانی دیکھنا پڑتی ہے۔ اب یہاں ملاح بہت تنگ کرتے ہیں۔ آدھ گھنٹہ سے بیٹھے ہیں کہ کوئی چھوٹی سی کشتی علیحدہ ہمارے لئے مل جائے، تو اُس میں سوار ہو کر چلے جائیں مگر یہ ملاح لوگ کہتے ہیں کہ کوئی چھوٹی کشتی سرے سے ہے ہی نہیں۔ سب بڑے بڑے مچھوے ہیں جن کے دام بھی یہ بہت مانگتے ہیں، آٹھ روپیہ، دس روپیہ، یہ تو دن دہاڑے ڈاکا ہے کتنی پریشانی اُٹھانا پڑتی ہے"۔

میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا، "آپ گھبرائیے نہیں، اب کشتی مل جائے گی، میں سب انتظام کئے دیتا ہوں، اور ہم آرام سے جہلم پار پہنچ جائیں گے"۔

لڑکی نے مڑ کر میری طرف دیکھا، اگر میں یہ کہہ دوں کہ اُس جیسا خوبصورت اور بھولا بھالا چہرہ میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا تو یقیناً ایک جھوٹ ہوگا، لیکن یہ کہہ دینے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ اُس کے چہرے میں کچھ ایسی عجیب کشش اور موہنی تھی جس نے مجھے ایک دم مسحور کر لیا۔ صرف ایک لمحہ کے لئے اس نے میری طرف دیکھا پھر وہ گھنی گھنی پلکیں اُس کے رخساروں پر جھک گئیں، وہ کشمیر کے حسنِ صبیح کا ایک نادر نمونہ تھی، دلکش خدوخال، سروقد دلاویز رنگت، لیکن جس چیز نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ اُس کی ظاہری خوبصورتی سے بھی بڑھ کر اُس کی نگاہوں کا حزن و ملال تھا جسے میں ایک جھلک ہی میں پا گیا، اُف، وہ الم ناک گہرائیاں! اُس ایک لمحہ میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کسی گہرے سمندر میں ڈوبا جارہا ہوں۔ پھر یکایک مجھے ٹھوکر سی لگی اور میں نے اپنے آپ کو کنارے پر پایا، کس قدر عجیب احساس تھا مگر یہ احساس

صرف ایک لمحہ تک ہی محدود تھا، دوسرے لمحہ میں وہ جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، اب اُس کا چہرہ صاف اور بھولا بھالا تھا۔ ہر قسم کے جذبات سے عاری میرے دل میں ایک نیم اضطراری کیفیت طاری ہو گئی۔

اتنے میں اور ایک دو مسافر آ کر درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ پہلے ایک بوڑھا آدمی، سفید ریش، لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا۔ اور "رام رام" کرتا ہوا میرے نزدیک بیٹھ گیا۔ پھر بچہ اُٹھائے ہوئے وہی کم عمر کی بدصورت عورت نمودار ہوئی۔ اُس کے ساتھ ایک قلی ٹرنک اور گٹھڑی اُٹھائے ہوئے تھا۔ وہ عورت بھی لڑکی کے قریب جا کر بیٹھ گئی اور چھوٹا بچہ سبز ساڑھی کے پلّو کو کھینچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ بھی آ گیا اور کچھ وقفے کے بعد اُس کا بھائی ایک کشتی کو کنارے پر لے آیا۔

عبداللہ نے مجھ سے مسکرا کر کہا "چلیئے کشتی میں بیٹھئے"۔

بوڑھے آدمی نے مخاطب ہو کر کہا۔ "مجھے بھی لے چلو بابا۔ رام تمہارا بھلا کرے"۔

بدصورت عورت بھی اُٹھ کھڑی ہوئی، کہنے لگی۔ "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں بھی اسی کشتی میں بیٹھ جاؤں۔ مجھے آج گوجرانوالہ پہنچنا ہے۔ اور اگر یہ گاڑی نہ ملی تو پھر —— اب شام بھی ہوتی جا رہی ہے اور میں اکیلی ہوں"۔

ہم سب کشتی میں جا کر بیٹھ گئے۔ قلیوں نے مال واسباب کشتی میں قرینے سے رکھ دیا۔

عبداللہ اور اُس کے بھائی نے آستینیں اوپر چڑھالیں اور ایک ایک ڈانڈ ہاتھ میں لے کر کشتی کے دونوں سروں پر کھڑے ہو گئے۔

اللہ کا نام لے کر کشتی چلی۔ عبداللہ نے گانا شروع کیا۔

جس دا ناں لیندیاں بیڑا پار وے
ڈاچی والیا موڑ مہار وے

عبداللہ نے رُک کر پوچھا۔ "آپ کو میرے گانے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

لڑکے نے جلدی سے کہا۔ "نہیں نہیں۔ ضرور گاؤ، تمہاری آواز بہت اچھی ہے"۔

عبداللہ نے پھر گانا شروع کیا۔ وہی "ڈاچی" کا پُرانا گیت، جسے گانے کے لئے سوز چاہئے۔ ساز نہیں۔ ایک سانڈنی سوار کو صحرا میں سے گزرتے دیکھ کر ایک اُداس حسینہ جو اپنے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اُسے رُک جانے کو کہتی ہے۔ اور پھر اُس سے التجا کرتی ہے کہ تُو مجھے سانڈنی پر بٹھا کر میرے بچھڑے ہوئے محبوب سے مِلا دے۔

ڈاچی والیا! موڑیں مہار وے   ڈاچی والیا! لے چل نال وے

لڑکے نے آہستہ مجھ سے کہا "ظالم! بہت اچھا گاتا ہے، کیا سُریلا گلا ہے۔ مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ ذرا سنو تو ـــــ"

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا، وہ اپنے بھائی کے شانوں سے سر لگائے ایک طرف بیٹھی تھی۔ آہستہ سے اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں، اُس کے لبوں پر ایک عجیب یاس انگیز مسکراہٹ آگئی۔ نہایت آہستہ سے اُس نے اپنے بازو چھاتی پر باندھ لئے اور ٹانگیں پھیلا کر نشست پر لیٹ گئی، اس طرح کہ میں اُس کے نصف چہرے کو دیکھ سکتا تھا، اُس کے خوبصورت ہاتھوں کو، اُس کے نازک ٹخنوں کو۔

میری ڈاچی دے گل وِچ ٹلیاں
میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں

عبداللہ کی پُرسوز آواز نے میرے جذبات کی سمٹی ہوئی دُنیا میں تلاطم پیدا کردیا، میرا دل ایک عجیب لذتِ درد کے مزے لینے لگا۔ یہ کیسی خلش تھی، ہلکی، میٹھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نغمے کی ہر لَے میں کسی مہجور حسینہ کی روح کھنچی ہوئی چلی آرہی ہے، یا دریائے جہلم کی وسیع چادرِ آب ایک صحرا ہے جس میں ہماری کشتی "ڈاچی" بنی ہوئی محبوب کی تلاش میں جا رہی ہے، رُوٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لئے

میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں . . . . . . ڈاچی

لڑکی نے چپکے سے ساڑھی کے پلّو سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے، اُس کے بھائی نے نہیں دیکھا لیکن میں نے اُسے دیکھ لیا۔ کیا ڈاچی کے حسین نغمے نے لڑکی کے دل میں محبت کی دبی ہوئی آگ کو روشن کردیا تھا۔ نہیں تو یہ آنسو کیسے؟ میرا دل اس اسرار کو جاننے کے لئے بے تاب ہوگیا۔ وہ کسی بچھڑے ہوئے محبوب کی یاد میں رو رہی تھی؛ میں نے چاہا کہ میں گلاب کی نرم ونازک پتیوں سے اُس کے آنسو پونچھ ڈالوں اور اُس سے پوچھوں "بتا اے حسینہ! تجھے کیا غم ہے؟"

اس کے بجائے میں نے اُس بدصورت عورت کی شرمائی ہوئی نگاہیں اپنے چہرے کی طرف جمی ہوئی دیکھیں۔ مجھے دیکھ کر اُس نے لجا کر اپنی آنکھیں نیچے کرلیں اور اپنے بچے پر جھک گئی۔

چھلک ـــ چھلک ـــ چھلک ـــ چھلک ـــ کشتی بھاگی جارہی تھی۔ ڈانڈیں باری باری ہل رہی تھیں۔ مغرب میں سُورج غروب ہورہا تھا، دریا میں ڈوب رہا تھا، دریا کی خاموش سطح پر ایک عجیب، نازک، نرالی، سحر طراز روشنی پھیل گئی تھی۔ میں نے سمجھا یہ غروبِ آفتاب نہیں، نمودِ سحر ہے۔ مغرب نہیں یہ مشرق ہے۔ روشنی کا منبع اعظم ہے، ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی نہ غرق ہونے والی کشتی پر سوار ہوکر اپنے محبوب سے ملنے جارہے ہیں۔ اپنے ابدی محبوب سے۔

"میں تاں ماہی نوں مناون چلیاں ـــ

چپ —— چپ —— شپ —— شپ ...... کشتی بھاگی جا رہی تھی۔

شام ہوگئی۔ اندھیرا بڑھتا گیا، عبداللہ خاموش ہوگیا۔ پھر ایک دلکش انداز سے سفید دودھ جیسی بے داغ چاندنی کھِل گئی! مجھے ڈل میں تیرتے ہوئے کنول کے پھول یاد آ گئے۔ کشتی کے چاروں طرف دور دور تک پانی کی ہلکی ہلکی ٹوٹتی ہوئی لہروں پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کنول کے لاکھوں پھول کھِل گئے ہیں۔

بوڑھا آہستہ آہستہ "رام رام" جپ رہا تھا، بدصورت عورت دزدیدہ نگاہوں سے کبھی مجھے، کبھی خاموش لیٹی ہوئی لڑکی کو دیکھ لیتی تھی۔ لڑکے نے ایک دوبار اپنی بہن کی طرف دیکھا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بچاری شاما، سفر کی تکان سے چُور ہو کر آخر سو گئی ہے۔ یہ سفر کتنا پریشان کُن ہے!"

کیا وہ واقعی سو رہی تھی، یا آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہی تھی، وہ بالکل بے حس و حرکت، ایک مرمریں مجسّمہ کی طرح پڑی تھی، یا شاید وہ کسی سپنے کی ٹھنڈی چھاؤں میں، ستاروں کی کپکپاتی ہوئی لا متناہی دُنیا میں اپنے محبوب سے مِل رہی تھی۔ یا پھر اُس کی آوارہ رُوح چاند کی کرنوں میں بھٹکی ہوئی کسی کو تلاش کر رہی تھی۔ ہاں، مگر کس کو؟

آخر ایک طویل عرصہ کے بعد اس طویل سکوت کو عبداللہ نے توڑ دیا۔ "لو وہ کنارا آ گیا" اُس نے ڈانڈ کو زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا۔

کنارے پر پہنچ کر میں نے لڑکے سے کہا، "آپ جا کر تانگہ وانگہ درست کریں، میں یہاں قلیوں کا انتظام کرتا ہوں"۔ تانگے والوں کا اڈّا کوئی فرلانگ بھر دُور تھا۔ لڑکا تانگے کا انتظام کرنے گیا۔ میں نے عبداللہ سے کہا "ذرا کہیں سے قلیوں کو تو بلوا دو"۔

عبداللہ کہنے لگا۔ "اب اس وقت یہاں دریا کے کنارے قلی کہاں سے آئیں گے"۔

"تو پھر اب کیا کیا جائے"۔

"میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ہم دونوں بھائی دو تین پھیرے لگا کر آپ کا اسباب تانگوں پر رکھ دیں۔ چار آنے فی پھیرا لیں گے"۔

"اچھا یونہی سہی، اُٹھاؤ اسباب اور ان (بدصورت عورت کی طرف اشارہ کر کے) کو بھی اڈّے پر لے چلو"۔

——— عبداللہ کے آخری پھیرے پر میں نے کشتی میں سوئی ہوئی لڑکی کو جگا دیا، "اُٹھیئے۔ اب تو جہلم کا دوسرا کنارہ بھی آ گیا"۔

میری زبان سے پہلا لفظ ادا ہونے پر ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ یقیناً سو نہیں رہی تھی، چاندنی رات میں اُس کا رنگ زعفران کے پھول کی طرح زرد پڑ گیا تھا اور ہونٹوں پر وہی یاس انگیز مسکراہٹ تھی۔

میں نے بٹوے سے ایک روپیہ نکال کر کہا "ایک روپیہ کا خردہ ہوگا؟"

اُس نے ہینڈ بیگ کھول کر پیسے نکالے اور مجھے دے دیئے۔ وہ نرم و نازک مخروطی انگلیاں برف کی طرح ٹھنڈی تھیں۔

مَیں نے عبداللہ کو انعام دیا، اُس نے جھک کر ہم کو سلام کیا اور پھر ہماری طرف پیٹھ موڑ کر کشتی میں بیٹھ گیا۔

ہم خاموش چلے آ رہے تھے۔ ہمارے آگے بوڑھا لاٹھی ٹیکتا جا رہا تھا، چند قدم چل کر میں نے شاما سے جرأت کر کے پوچھا "آپ کشتی میں رو رہی تھیں۔ کیوں؟"

وہ خاموش چلتی گئی، سر جھکائے ہوئے۔

میں نے پھر کہا۔ "میں نے یقین جانئے نہایت دلی خلوص سے سوال کیا ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ آپ اپنا دُکھ مجھ سے کہہ سکیں اور میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔ کوئی ہرج ہے؟"

اُس نے نمناک نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی، کہ یکایک کچھ سُن کر وہ ایک ہلکی سی چیخ مار کر ٹھٹک گئی، وہ گرنے کو تھی کہ میں نے اُسے ایک بازو سے تھام کر سہارا دیا۔ عبداللہ چاند کی طرف مُنہ کئے ہوئے گا رہا تھا۔

ساڈی ڈاچی دے گل وچ ڈھولنا
جھوٹے ساجناں دے نال کی بولنا!

ڈاچی والیا موڑیں ۔۔۔۔۔

آواز، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُور پرے جہلم کے پھیلے ہوئے پانیوں پر چاند کی سحر فشاں کرنوں پر لرزتی ہوئی آ رہی ہے۔ اندازِ بیان میں بلا کی شوخی تھی اور فقروں میں ایک بے پناہ طنز، جو دل کو چھیدے ڈالتی تھی۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا، وہ کانپ رہی تھی اور جلد جلد قدم اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید وہ اس حزیں نغمے کے سیل بے پناہ سے دُور بھاگنا چاہتی تھی، وہ طوفان جو اُس کی بے قرار روح کے پیچھے بھاگ رہا تھا، آہ، مگر کیوں؟

باقی راستہ ہم نے خاموشی میں طے کیا۔

× × × × × × × ×

جب میں انہیں تانگوں پر سوار کر چکا، تو لڑکے نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، "شکریہ، بہت بہت شکریہ، ہم نے آپ کو بہت تکلیف دی . . . . کیا آپ کا گاؤں یہاں سے نزدیک ہے؟ . . . ."

"بس کوئی تین چار میل ہوگا، وہ سیدھی پگڈنڈی جا رہی ہے . . . . پیدل ہی جانا ہوگا . . . ."

بدصورت عورت نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور پھر سر جھکا لیا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر سر کو جھکایا، دو دفعہ۔ ایک دفعہ بدصورت عورت کو دیکھ کر اور آخری بار لڑکی کو دیکھ کر۔ لڑکی نے میری طرف مبہم، خمار آلود، اندوہگیں نگاہوں سے دیکھا، وہ نگاہیں شاید کھُل کر دل کا راز کہہ دینا چاہتی تھیں، مگر کامیاب نہ ہو سکیں۔ اُن آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی مگر پھر فوراً ہی گم ہوگئی، جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں کھو جائے۔ اُس کا داہنا بازو تھوڑا سا اوپر اُٹھا بھی اور پھر نیچے گر گیا۔ چوڑیوں کی جھنکار پیدا بھی ہوئی اور پھر ایک لمحہ میں لرزتی ہوئی کہیں غائب ہوگئی، جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضا میں گھُل جائے . . . . . اب وہ نظر نیچی کئے ساڑھی کا پلّو ٹھیک کر رہی تھی۔

"گڈ بائی" میں نے جلدی سے کہا۔

"تانگا چلنے لگا، لڑکے نے زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔" گڈ بائی"

سیدھی، کھیتوں کے بیچوں بیچ پگڈنڈی جا رہی تھی آسمان پر ستاروں کے درمیان بھی اسی طرح ایک پگڈنڈی بنی ہوئی تھی . . . . "یہ سفر کب شروع ہوا؟" . . . . میں سوچنے لگا . . . . "یہ دونوں پگڈنڈیاں کدھر جا رہی ہیں؟ . . . . یہ سفر کبھی ختم ہوگا؟ . . . . . ."

کرشن چندر ایم۔ اے

ہندوستان

کوئی کہتا ہے : ہندوستان جنت نشان!

کوئی کہتا ہے : بدبخت ہندوستان!

کوئی کہتا ہے : یہ ملک نہیں برِ اعظم ہے، اتنی قومیں، اتنی زبانیں، اتنی قسم کی آب و ہوا!

کوئی کہتا ہے : یہ ہمیشہ کے لئے غلام بنا رہے گا!

کوئی کہتا ہے : یہ جلد آزاد ہونے والا ہے!

اس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک انوکھا ملک ہے اور اس کے مسائل بھی انوکھے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مسائل کبھی حل نہ ہونگے!

دردمندو! اپنی ہمت کو کام میں لاؤ!

جل کی ترنگ

چھم چھم کرتی، ناچتی گاتی آئی ہے برسات!

میگھ ناتھ ہیں دیوتا اس کے، یہ ہے دیوداسی،
سب اِس کے ہیں پیاسے، پر یہ میگھ ناتھ کی پیاسی!

میرے مُردہ دل کے اندر مچلے ہیں جذبات!
چھم چھم کرتی، ناچتی گاتی، آئی ہے برسات!

راگ رنگ کا موسم آیا، گائیں، ناچیں، گائیں،
رس کی میٹھی میٹھی بوندیں من میں مستی لائیں!

دِن اِس رُت کا رات سے اچھا دن سے اچھی رات،
چھم چھم کرتی، ناچتی گاتی آئی ہے برسات!

ہوا چلی ہے، پیڑ ہلے ہیں، پھیلی بھینی باس،
پنچھی بولے خوش ہو ہو کر، کیوں ہوتے ہو نراس؟

سُوکھی چیزیں ہری ہوئی ہیں، ہرے پھُول اور پات،
چھم چھم کرتی، ناچتی گاتی آئی ہے برسات!

مُورکھ، گیانی، سادھو، پاپی، سب میں آئی جان،
پربت وادی خوش ہیں سارے، خوش جنگل، میدان!

اِس موسم میں خوشیاں مِل کر ناچیں سب کے سات،
چھم چھم کرتی، ناچتی گاتی، آئی ہے برسات!

نئی ہے بستی، نئے لوگ اور نئی آن اور شان،
نئی سانجھ اور نیا سویرا، بالکل نیا جہان،

نئی امنگیں، نئی امیدیں، نئی ہر اک ہے بات،
چھم چھم کرتی، ناچتی گاتی آئی ہے برسات!

میراجی

زُہرہ کا عشق

ایک دن دورانِ گفتگو میں خودکشی پر بحث ہونے لگی۔ کوئی کہتا تھا خودکشی کرنا کمزوری کی نشانی ہے، کوئی یہ کہ بُزدل شخص خودکشی کر ہی نہیں سکتا۔ احسن حسبِ معمول اپنی علیحدہ ہی رٹ لگا رہا تھا کہ خودکشی شخصی آزادی کی بہترین مثال ہے۔ میں نے اس سے کہا بھئی اس کا یہاں کیا تعلق ہے؛ مگر اچھا ہُوا میں نے اپنی بات کو طول نہ دیا ورنہ وہ کہیں سے ایسے ایسے لائل نکالتا کہ ہم سب کا ناطقہ بند کر دیتا۔ بحث دراصل ممتاز اور غضنفر میں ہو رہی تھی۔ ممتاز کہتا تھا کہ "بزدلی اور دلیری کی صفات علم النفس میں یقیناً علیحدہ علیحدہ شمار ہوں گی مگر زندگی میں ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کوئی خاص فعل محض دلیری کی وجہ سے واقع ہُوا اور کسی ور کی تہ میں فقط بُزدلی ہی تھی، اکثر اوقات بُزدلی اور جرأت دونوں کچھ اس طریقہ سے ملی ہوئی ہوتی ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ آیا وہ شخص اس وقت ہمت ہار بیٹھا تھا یا اس کے فعل کی محرک پریشانی یا رنج یا مجبوری یا شرم تھی۔ مثلاً مجھے ایک واقعہ یاد ہے جہاں ایک شخص نے محض حیا کے مارے خودکشی کر لی تھی۔" غضنفر نے پوچھا "حیا کہ غیرت؟" ممتاز نے کہا "حیا بھئی حیا۔ اگرچہ وہ آدمی تھا بھی نرالا ہی۔" ہمیں کچھ جستجو ہوئی۔ احسن نے پوچھا "نرالے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" ممتاز نے کہا "اس کی طبیعت کچھ عجیب سی تھی۔ میں نے اپنی عمر میں اتنا شرمیلا انسان کبھی نہیں دیکھا۔ جس وجہ سے اس نے خودکشی کرنی چاہی تھی وہ بھی ایسے واقعہ سے تعلق رکھتی ہے کہ شاید تم باور نہ کر سکو۔ مگر چونکہ وہ سب قِصّہ میری آنکھوں کے سامنے گزرا تھا، اس لئے مجھے اس کی ایک ایک بات یاد ہے۔" یہ کہہ کے وہ خاموش ہو گیا۔

میں تو شاید اصرار نہ کرتا مگر احسن کہاں باز رہ سکتا تھا۔ اس نے بلا تکلّف کہہ دیا کہ بھئی اگر دلچسپ ہے تو سنا دو۔ ممتاز نے کچھ سوچ کے کہا "جس طرح کی دلچسپی تم چاہتے ہو وہ تو اس میں نہیں، مگر واقعہ ہے سچا۔ اور شاید اسی وجہ سے تھوڑا سا عجیب بھی"۔ اس کے بعد وہ پھر چُپ ہو گیا جیسے کوئی چیز زیادہ کہنے سے اسے مانع ہے۔ مگر جب ہم سبھی اصرار کرنے لگے اور وہ پس و پیش کرتے کرتے عاجز آ گیا تو مجبور ہو کر اس نے ہمیں سنا ہی دیا۔

اس نے کہا "اس واقعہ کو گزرے کوئی پندرہ سال ہو گئے ہوں گے۔ میری عمر اِن دنوں سترہ یا اٹھارہ سال کی ہو گی، میں مشن کالج میں سکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا۔ میری دوستی کچھ عرصے سے ایک فرسٹ ایئر کے لڑکے سے ہو گئی تھی۔ اس کا نام محبوب تھا۔ اور وہ فقط اس لئے کہ ان کے داخلہ کے وقت اور لڑکوں کو ہم مذاق کرتے تو زیادہ گھبراتے یا غصہ کرتے یا بھاگ جاتے یا ہم سے منّت

کرتے مگر یہ بیچارا یوں چپ ہو کے کھڑا ہو جاتا جیسے کوئی بُت ہوتا ہے۔ آنکھیں اس کی ایسی شرمیلی تھیں جیسے کسی لڑکی کی ہوتی ہیں۔ رنگ گندمی اور بدن نازک، ہمیں تو یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی لڑکی ہو۔ ایک دن جو وہ قابو میں آ گیا، میرے ساتھیوں نے اسے بھی وہی مذاق اور وہی ٹھٹھے کرنے شروع کر دیئے جو دوسرے لونڈاروں سے ہوتے تھے۔ مگر چونکہ وہ کوئی جواب ہی نہ دیتا تھا اور رنگ بیچارے کا ہر لحظہ زرد ہوتا جا رہا تھا، میں نے اس کا پیچھا چھڑا دیا۔ مگر اس کے بعد مجھے اس سے کچھ دلچسپی ہوتی گئی اور اگرچہ پہل تو میری طرف سے ہی ہوئی مگر کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں میں سلام علیک ہو گئی۔ پھر بھی یہ مرحلہ دو مہینے سے کم میں طے نہیں ہُوا ہوگا اس اثنا میں شاید اس نے میری طرف ایک دفعہ نظر اُٹھا کے دیکھا ہو۔ مگر رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بڑھتے گئے اور چونکہ کچھ قدرتی طور پر ہمارے میلانات میں یگانگت تھی اس لئے آپس میں خلوص اور دوستی بڑھتی گئی۔ چھ مہینے اسی طرح گزر گئے۔ مارچ کے دن آ گئے اور یونیورسٹی کے امتحان میں ڈیڑھ مہینہ رہ گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ تیاری کی چھٹیوں میں گھر چلا جاؤں اور وہاں کامل سکون اور دلجمعی سے پڑھوں۔ مگر محبوب نے بہت مجبور کیا کہ ہمارے گھر رہو۔ وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی اور مجھے بھی ایک مشکل میں مدد دے سکو گے۔ میں نہ سمجھا کیا مشکل ہے۔ خیال بھی آیا تو یہی کہ یہ مشکل نصاب سے تعلق رکھتی ہو گی۔

چونکہ محبوب کی طبیعت ہی بہت متین اور شرمیلی تھی اس لئے اس کی معمولی سی خواہش کو رد کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ اور اس کا اصرار بھی کبھی پُرزور نہ ہوتا تھا مگر کم بخت کی آنکھوں میں کچھ ایسا اثر تھا کہ جب وہ کوئی چیز مانگ لیتا تو انکار کرنا فضول ہوتا اور مجھے اپنے گھر لے جانے میں جب اُس نے غیر معمولی اور خلافِ عادت اصرار کیا تو مجھ سے انکار ہو ہی نہ سکا۔ مگر مجھے خیال ضرور ہو گیا کہ میرے لے جانے میں علاوہ میرے قرب کی خواہش کے کوئی وجہ اور بھی ہے۔ دِقت فقط یہ تھی کہ ان کا مکان شہر میں تھا پھر بھی جب پندرہ مارچ کو ہمیں چھُٹیاں ہوئیں تو میں ہوسٹل چھوڑ محبوب کے ہاں چلا گیا۔ اس کا مکان ایک گلی میں کھلتا تھا اور باہر کی طرف ایک دیوان خانہ تھا جو محبوب کے سپرد تھا۔ یہ دروازہ کے دائیں طرف تھا۔ بائیں طرف ایک اور دیوان خانہ تھا جو اس کے والد استعمال کرتے تھے۔ گلی کوئی زیادہ چوڑی نہ تھی۔ آمنے سامنے مکانات تھے۔ اور تقریباً سب ہی محبوب کے دور نزدیک کے رشتہ داروں کے۔ کم از کم مجھے تو اب یہی خیال آتا ہے کہ اُس محلہ میں شاید ایک ہی برادری کے لوگ رہتے تھے۔ بیٹھک کے اندر دو اور چھوٹے کمرے تھے جن میں سے ایک میرے سپرد کر دیا گیا تھا۔ ان کمروں کی کھڑکیاں پچھلی طرف ایک احاطہ میں کھلتی تھیں۔ روشنی اور ہوا کا انتظام اچھا تھا۔ دیوان خانہ بھی خوب سجا ہُوا تھا۔ تین چار کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں۔ کھڑکیوں کے اوپر روشن دان تھے مگر ان پر چھجے نہ تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ روشنی آ سکے یا شاید غفلت اور بے توجہی کی وجہ سے یا شاید فیشن ہی کی بات ہو گی۔ بہرحال یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان پر چھجے نہ تھے۔ اور روشن دان معلوم نہیں کیوں، اکثر بند ہی رہتے تھے۔ مگر چونکہ محبوب کو صفائی کا بہت خیال رہتا، روشن دانوں کے شیشے ہمیشہ صاف ہی رہتے۔ دیوان خانہ

میں بیٹھے ہوئے اگر کبھی نگاہ اُٹھتی تو ان روشن والوں میں سے سامنے کے مکان کی گیلری نظر آجاتی۔ یہ سب کچھ اس لئے بتا رہا ہوں کہ ان سب چیزوں کا ذکر کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔ مارچ کے دنوں میں تو ہم نیچے ہی سوتے رہے مگر اپریل میں ہمیں اوپر جانا پڑا۔ خوش قسمتی سے ان کے مکان کی چھت دو حصوں میں منقسم تھی اور چونکہ مکان کی وضع ہی اس قسم کی تھی، اس لئے مجھے اوپر لے جانے میں اسے پردہ کرانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ چھت پر سے آس پاس کے مکان بہت نزدیک دکھائی دیتے تھے اور تقریباً سب مکانوں کی چھتیں برابر برابر ہی تھیں فقط پردہ کے لئے لوگوں نے لکڑی کی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں۔

"جب میں محبوب کے ہاں چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ سوائے اس وقت کے جب اُسے مجبوراً اکیلا باہر جانا پڑتا یعنی کالج جاتے اور آتے، کیونکہ ان کی جماعتوں کو تو چھٹیاں نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اوّل تو باہر جاتا ہی کم اور جاتا تو اکثر کوشش کرتا کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ کئی دفعہ جب میں کسی کتاب کے مطالعہ میں مستغرق ہوتا یا کوئی اور چیز یاد کر رہا ہوتا تو ہچکچاتے ہوئے کہتا مگر میں زیادہ توجہ نہ دیتا اور اپنے کام میں مشغول رہتا۔ ایسے موقعوں پر مجھے کئی دفعہ محسوس ہوتا کہ جیسے وہ باہر اکیلا جانے سے اگر ڈرتا نہیں تو گھبراتا ضرور ہے۔ اور بعض دفعہ تو میرے انکار کرنے پر وہ خود ہی باہر جانے کا ارادہ چھوڑ دیتا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ بھئی کیا بات ہے تم اپنے محلے میں سے گزرتے ہوئے کیوں گھبراتے ہو۔ اس پر وہ ایسا پریشان ہُوا کہ کیا بتاؤں گھبراہٹ میں پوری بات نہ ہو سکتی تھی۔ "کچھ نہیں کچھ نہیں" کہہ کے ٹال گیا۔ مگر آخر میرے ساتھ ہی دن رات رہتا تھا کب تک چھپاتا۔ ایک رات جب میں پڑھ کے فارغ ہُوا تو دیکھا کہ اپنی کرسی پر بیٹھا کسی گہرے سوچ میں پڑا ہے۔ میں نے جو بلایا تو چونک پڑا۔ بھویں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے تکلیف کا احساس ہوتا تھا۔ اس دفعہ جو میں نے بہت اصرار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی زندگی محلہ کی دو تین لڑکیوں نے تنگ کر دی ہے۔ میں نے کہا "لڑکیوں نے؟" کہا "ہاں"۔ میں بہت حیران ہُوا۔ میں نے پوچھا "وہ کیسے؟" معلوم ہُوا کہ اس محلہ میں اس کے اپنے ہی رشتہ داروں میں دو ایک لڑکیاں تھیں جو اسے راستہ گزرتے چھیڑتی تھیں۔ اب تمہیں اندازہ لگالو کہ وہ کیسا شخص ہوگا جو لڑکیوں کے مذاق سے اتنا پریشان ہو جاتا ہو۔ پوچھنے پر معلوم ہُوا کہ یہ شکایت اسے کم و بیش چھ مہینے سے تھی۔ کبھی تو کوئی جب وہ گزرتا کاغذوں کے چھوٹے چھوٹے پرزے اس پر پھینک دیتی، کبھی کوئی گلاب کی پتیاں مٹھی بھر کے اُس پر چھوڑ دیتی۔ کبھی کوئی چھوٹا موٹا کنکر ہی کہیں سے اسے آ لگتا۔ ایک دفعہ جب وہ گزر رہا تھا تو سُرخ رنگ کا ایک چھوٹا سا ریشمی رومال ہی اس کے سامنے آگرا۔ اوپر کو دیکھا تو ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ شوخ تھی کھڑکی میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اب رومال کو وہاں سے اُٹھا لیتا تو خوف کہ کوئی دیکھ نہ لے اور نہ اُٹھائے تو معلوم نہیں وہ لڑکیاں کیا آفت مچائیں۔ اور سب سے زیادہ اسے یہ شرم کہ ان نے رومال کو گرتے ہوئے دیکھ لیا ہو تو! گھبرایا تو وہ بہت مگر اُس نے رومال وہاں سے نہ اُٹھایا۔ اسی دوپہر کو جب وہ کالج سے آیا تو جبھی اپنے

دھیان میں آنکھیں نیچی کئے گلی میں سے گزرا کسی نے اوپر سے پانی پھینک دیا۔ اسے بہت غصّہ آیا چنانچہ آپ نے جا اپنی والدہ سے شکایت کردی کہ یہ لڑکیاں مجھے راستہ نہیں گزرنے دیتیں۔ کبھی کاغذ پھینک دیتی ہیں اور کبھی پانی"۔

اس پر غضنفر نے کہا "لاحول ولاقوۃ عجیب جانور تھا" جواب میں احسن نے کہا "بکواس نہ کرو سننے دو، یا کبھی توفیق ہو وینس اور ایڈونیس کے قصّہ کو پڑھو"۔

ممتاز نے اپنی حکایت جاری رکھتے ہوئے کہا" اب اسی سے اندازہ کرلو کہ وہ کس فطرت کا مالک تھا۔ بعد میں مجھے یہ خیال ہُوا کہ شاید وہ ابھی جوان ہی نہ ہُوا ہو اس لئے اُسے ان لڑکیوں کی چُہلیں پسند نہ آتی ہوں۔ مگر اس کی عمر اس وقت سترہ سال سے کم نہ تھی اور یوں جسم کے لحاظ سے اگرچہ نازک بدن تھا منحنی تو نہیں تھا، درمیانہ قد تھا، اور کھلے پائنچوں کے پاجامے، بوسکی کی قمیصیں اور چھوٹے کوٹ اسے بہت بھاتے تھے۔ امیر گھر کا بیٹا تھا۔ گھر والوں نے اس ناز سے پالا تھا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ دن میں دس مرتبہ اس کی والدہ اندر سے پوچھوا بھیجتی تھیں کہ کچھ چاہئے تو نہیں۔ پھل ہر وقت میز پر پڑا رہتا تھا۔ تمہیں حیرانی ہوتی ہے کہ اس نے یہ بات اپنی والدہ سے کہہ کس طرح دی؛ اور پھر شکایت تو اس بات کی کہ چند شوخ مزاج لڑکیاں اس سے مذاق کرنا پسند کرتی ہیں۔ مگر اس کی حیا کا یہ عالم تھا کہ اوّل تو اس نے شکایت ہی ایسے الفاظ میں کی جن سے اس کی والدہ بہت برافروختہ نہ ہوئیں اور دوسرے نہ اس نے رومال کا ذکر کیا اور نہ پانی کا۔ بلکہ جب اس کی والدہ نے ان لڑکیوں کے نام پوچھے تو کیونکہ یہ تو سب کو معلوم تھا کہ لڑکیاں جان پہچان کی چھوڑ رشتہ برادری ہی کی ہونگی تو محبوب نے نام بھی ٹھیک طور پر نہ بتائے اور اس شعلہ خو رومال والی کا نام ہی نہ لیا۔ اماں نے یونہی تسلّی کردی کہ بیٹا تمہاری ہم عمر ہیں اور تمہیں بچپن سے جانتی ہیں کہیں بے خبری میں کچھ پھینک دیا ہوگا۔ محبوب کی والدہ نے اس لئے بھی خیال نہ کیا کہ وہ محبوب کو بالکل نابالغ اور معصوم ہی سمجھتی تھیں۔ غرض یہ کہ انہوں نے اس بات کو مذاق ہی میں ٹال دیا مگر شاید اشارۃً یا کنایۃً ان لڑکیوں یا ان کی بڑی بوڑھیوں سے کچھ نہ کچھ کہا ہوگا کیونکہ اس کے بعد دو ایک ہفتہ تک آرام رہا۔ مگر پھر وہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ البتہ ان میں اور تو اب بہت کم مگر وہ رومال والی جس کا نام زہرہ تھا، اب بھی اسی آن بان سے ستم رانی میں مصروف رہتی۔ بعد میں مجھے بھی اسے دیکھنے کا اتفاق ہُوا ہے۔ یقین جانو کہ جتنی زندگی اور دمک اور شعلہ پن میں نے اس میں دیکھا تھا کسی اور میں نہ دیکھا ہے نہ دیکھوں گا۔ اس کی نظر ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں خون کی جگہ بجلی دوڑ رہی ہے۔ اور اس کی طرف ایک نظر سے زیادہ دیکھنا کم از کم میرے احاطۂ قدرت میں تو نہیں تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس قدر گہری اور پُرکشش تھیں کہ آدمی اسے دیکھ کے مسحور ہو جاتا تھا اور اس بات کو اب پندرہ سال گزر چکے ہیں"۔ یہ کہہ کے ممتاز نے ایک ہلکا سا ٹھنڈا سانس بھرا۔

پھر اس نے کہا "جب محبوب نے مجھے بتایا، تم سمجھ ہی سکتے ہو میں کتنا حیران ہُوا ہوں گا، میں اس کے چہرے اور

لہجے سے جان سکتا تھا کہ اس کے لئے نہ تو یہ مذاق کی بات تھی اور نہ لطف کی۔ واللہ اعلم اس کا خمیر کس قسم کا تھا۔ ورنہ کوئی اور اس کی جگہ نہ جانے اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھتا۔ کیونکہ جیسا جذبہ میں نے زُہرہ میں دیکھا، اس کی مثال شاید میں تو کبھی نہیں دیکھوں گا۔ میں نے محبوب کو بہت تسلّی دی اور کہا کہ بھئی تم ناحق اپنا خون پیتے ہو۔ اگر وہ لڑکیاں دیوانی ہوئی ہیں تو ہونے دو، تمہیں دیر سے جانتی ہیں، اپنا دل خوش کرتی ہیں کریں۔ تم کیوں پرواکرتے ہو۔ اور خود ہی تو کہتے ہو کہ سوائے ایک کے باقی رہ نے چھیڑنا ہی کم کر دیا ہے۔ مگر محبوب کو میرے لفظوں سے کامل تسلّی نہ ہوئی۔ البتہ مجھے محسوس ہُوا کہ مجھے بتا دینے سے اُسے کچھ ڈھارس ضرور ہوئی ہے۔ اگرچہ مجھے یہ وعدہ کرنا پڑا کہ کبھی کبھی جب اسے باہر جانا ہو تو میں اس کے ساتھ جایا کروں گا۔ اس لئے بھی کہ مجھے خود ان لڑکیوں کے دیکھنے کا شوق ہُوا جو اس بیباکی سے اور اس طور پر اقدام کر سکتی تھیں۔

"چنانچہ میں نے دوسرے دِن ہی سہ پہر کے وقت باہر جاتے ہوئے اوپر جو نظر اُٹھائی تو مجھے ایک لڑکی دکھائی دی۔ شاید اس کے ہاتھ میں کچھ ہو یا وہ یونہی اتفاقیہ جھانک رہی ہو، مگر مجھے دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ گئی۔ محبوب نے نہ اوپر سر اُٹھایا اور نہ اسے دیکھا۔ ساتھ کے مکان کے نیچے سے ہم گزرے تو محبوب نے شاید ڈر کی وجہ سے یا یونہی بلا قصد اوپر دیکھا تو میں نے بھی نظر اُٹھائی۔ واقعی کھڑکی آدھی کُھلی تھی اور اس میں سے سیاہ بالوں اور سُرخ ہونٹوں کی مجھے ایک جھلک سی نظر آئی اور پھر ایک چھوٹی سی گیند بیچارے محبوب کے سینہ پر آن گری اور گر کے لڑھکتی ہوئی نالی میں جا پڑی۔ محبوب تو ایسا چکرایا جیسے کوئی پہاڑ آن گرا ہو، مگر میں اس گیند کو اُٹھانے کے لئے لاشعوری طور پر جھکا۔ ابھی اُٹھائی نہیں تھی کہ محبوب نے مجھے روک دیا۔ میں نے سیدھا ہو کے اردگرد دیکھا مگر محلہ کی کھڑکیوں میں سوائے دو ایک بچوں کے اور کوئی نہ تھا اور جس کھڑکی میں سے گیند آئی تھی وہاں ایک چھوٹا سا بچہ چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا "میلی گیند میلی گیند۔"

"اب میں خود پریشان ہُوا کہ یہ کیا مخمصہ ہے۔ اگر ہر وقت محبوب کے ساتھ ساتھ پھروں تو پڑھائی مشکل اور اگر اس معاملہ کے متعلق اس سے باتیں نہ کروں اور کوئی تجویز نہ سوچوں تو اسے تکلیف اور مشورہ ہو تو کیا ہو؛ معلوم نہیں تھا کہ ان لڑکیوں یا اس لڑکی کے دل میں کیا تھا؛ ان کے خاندانوں کے آپس میں کیا تعلقات تھے؛ محبوب کے صحیح جذبات کیا تھے؛ یہ بات محض چھیڑ خانی تھی یا اس کا کچھ انجام بھی ممکن تھا؛ مگر میں نے یہی کیا کہ اول تو محبوب کو موقع نہ دیتا کہ وہ اکیلا وہاں سے گزرے اور جب ہمیں باہر جانا ہوتا، شام کو یا سہ پہر کو تو میں ساتھ ہوتا۔ صبح کالج جاتے وقت اور کالج سے آتے وقت جو اس سے بیتتی، اس کا علاج میرے پاس نہ تھا۔ کبھی کوئی پھول آ گرتا اور کبھی کوئی ربن کا ٹکڑا، کبھی کوئی ربڑ کی گیند، کبھی کچھ اور۔ اگر یہ بات یہیں تک رہتی تو کیا تھا! مگر کچھ دنوں کے بعد یہ ہُوا کہ ایک سہ پہر کو ہم دونوں بیٹھک میں پڑھ رہے تھے کہ اچانک ایک روشن دان کے شیشے پر کوئی چیز آ کے لگی اور ایک شیشہ ٹوٹ گیا۔ ہم نے اوپر دیکھا، شیشوں میں سے اوپر سامنے مکان کی گیلری نظر آ رہی تھی مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے سر نکال

کراوپر دیکھا، ادھر اُدھر نظر ڈالی، مجھے کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ ہم نے خیال کیا کہ یونہی کسی بچے وچے نے کہیں سے کوئی کنکر یا کوئی اور چیز پھینکی ہوگی اور وہ اتفاق سے یہاں آگئی۔ ہم نے بات بھلا دی مگر محبوب کی عادت تھی کہ کوئی چیز لوٹ جائے یا بگڑ جائے، یا اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو جب تک اس کی جگہ نئی چیز نہ آلے یا جب تک وہ درست نہ ہولے، اسے چین نہ آتا تھا۔ مثلاً وہ شیشہ جو لوٹ کے گرا تھا۔ پہلے تو اس نے وہ اُٹھا کے باہر پھینکا، پھر اندر نوکر کو آواز دی کہ سیڑھی لائے، پھر سیڑھی پر چڑھ کے فُٹ رُول سے شیشہ کا سائز ماپا، اور نوکر کو شیشہ لانے بھیجا۔ ایک گھنٹہ میرا بھی خراب کیا اور اپنا بھی۔ حالانکہ یہ کام پھر کسی وقت کر لیتا، مگر یہ اُس کی فطرت تھی کہ اگر چیز اِدھر کی اُدھر ہوجاتی تو آرام اپنے اوپر حرام کر لیتا، جب تک وہ چیز پھر اپنی اصلی جگہ نہ آجاتی۔

"شام سے پہلے اس نے وہ شیشہ وہاں جڑ دیا۔ مگر وائے بیچارے کی قسمت، دوسرے دن ہم دونوں کو کالج جانا تھا۔ مجھے شاید کوئی کالج کے دفتر میں کام تھا یا کسی سے کوئی کتاب لینی تھی، میں بھی اس کے ساتھ ہی کالج گیا۔ البتہ واپس اس سے پہلے آگیا۔ آکے دیکھتا ہوں کہ ایک شیشہ اور لوٹا پڑا ہے۔ اب مکان محبوب کا تھا، اور پڑوسی بھی اسی کے تھے، میں حیران تو ہؤا اور مجھے غصہ بھی آیا مگر کیا کرسکتا تھا۔ شیشے کے ٹکڑے چن کے میں نے میز پر رکھ دیئے اور پڑھنے لگ گیا۔ جب محبوب آیا تو میں نے اُن کی طرف اشارہ کردیا۔ اسے بہت غصہ آیا۔ مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، وہ شرم وحیا کا پُتلا اگر ایک دفعہ اپنی والدہ سے تنگ آکے ایک بات کہہ چکا تھا اور وہ بھی میرے آنے سے پہلے تو اب اس کے لئے کسی اور امر کی شکایت کرنا ناممکن تھا۔ اور اس لئے بھی کہ کالج میں ایک سال پڑھنے سے اور میرے ساتھ تعلقات سے یوں بھی اُس میں برداشت اور تحمّل کا مادہ بڑھ گیا۔ اور پھر مجھے تو شک نہیں تھا مگر اس نے خود ہی کہہ دیا کہ یہ کسی لڑکے وڑکے کا کام نہیں۔ میں نے پوچھا۔ "تو اور کون خبطی ہے جو یوں دوسروں کے شیشے توڑتا پھرتا ہے؟" وہ چپ ہو رہا۔ مگر اس دفعہ اس نے شیشہ دوسرے دن منگوایا اس کے بعد دو تین دن آرام رہا مگر ایک سہ پہر کو یہی ہؤا، ہم بیٹھے پڑھ رہے تھے کہ کھٹ کر کے ایک موٹا سا اینٹ کا ٹکڑا آکے درمیانی روشن دان پر لگا اور وہ ٹکڑا اور شیشہ دونوں اندر آگرے۔ میں نے فوراً جو اوپر دیکھا تو مجھے زہرہ کا چہرہ ایک لمحے کے لئے دکھائی دیا۔ میں نے محبوب کی طرف دیکھا وہ بھی دیکھ رہا تھا مگر اس طرح جیسے کوئی کسی چیز سے مسحور ہو گیا ہو۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے زہرہ کو دیکھا یا نہیں، مگر اس کے بعد کچھ دنوں تک اس نے شیشہ لگوانے کا نام نہیں لیا۔ مگر ایک شام کو ایسا واقعہ پیش آیا کہ میں اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کرسکا۔ شام کے کوئی آٹھ بجے ہم بیٹھے پڑھ رہے تھے، شاید ہوا چل رہی تھی یا کیا بیٹھک کی کھڑکیاں بند تھیں اور یوں رات کو ہم بند کر کے ہی پڑھا کرتے تھے اس لئے بھی کہ لوگوں کی عادت ہے کہ خواہ چکیں پڑی ہوئی ہوں اندر روشنی دیکھ کے باہر سے جھانکنے کو ضرور ٹھہر جائیں گے۔ دن کو البتہ چکیں پڑی رہتی تھیں اور یہیں آرام رہتا تھا۔ اس وقت وہ دروازہ جو اندر جانے والے راستہ میں کھلتا تھا، کھلا تھا اگرچہ اس پر بھی چک پڑی تھی۔

میں شاید اپنے سونے کے کمرے میں گیا تھا۔ کسی کتاب کو ڈھونڈنے یا کوئی اور چیز لینے کے لئے بیٹھک کی وسط میں میز تھی۔ ارد گرد کرسیاں تھیں۔ میری کرسی کا رُخ کھڑکیوں کی طرف تھا اور جس کرسی پر محبوب بیٹھا پڑھ رہا تھا اِس کا رُخ اُسی دروازہ کی طرف تھا۔ جس سے ہم بیٹھک میں داخل ہوتے تھے۔ میں اپنے کمرے کی بجلی بجھا کے باہر نکلنے کو تھا کہ میری نظر چک پر پڑی اور میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

"وہاں چک اُٹھائے زہرہ اندر دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اسے میں نظر نہیں آیا اور نہ ابھی تک اسے محبوب نے دیکھا تھا۔ میں تو قدرے اندھیرے میں تھا اور محبوب نیچی نظر کئے پڑھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اندر داخل ہو گئی۔ شاید چک کے واپس گرنے سے یا کواڑ کے آدھا بند ہو جانے سے جسے زہرہ نے غالباً بغیر غور کئے ہاتھ کی جنبش سے دھکیل دیا تھا۔ محبوب چونک پڑا۔ اس وقت اس کا حلیہ دیکھنے کے قابل تھا۔ مُنہ کھُلے کا کھُلا اور آنکھیں جو پہلے ہی بڑی بڑی تھیں پوری حد تک کھُل گئی تھیں۔ اور رنگ تو اس کا یونہی زرد پڑ جاتا تھا۔ اور حقیقت میں تھی بھی ایسی ہی عجیب اور خرق العادت بات۔ محبوب کے تو چھوڑ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ زہرہ چھوڑ کوئی لڑکی بھی کسی کے پاس یوں آن دھمکے گی۔ یہ بھی مان لیا کہ اس سے دو تین سال پہلے وہ بے تکلف محلے میں دوڑتی پھرتی ہو گی، کیونکہ محبوب کے رشتہ داروں میں نے دیکھا تھا آپس میں کوئی ایسا پردہ وردہ نہ کرتے تھے۔ اور شاید میرے اور ایک آدھ اور آدمی کے محلہ میں کوئی غیر شخص رہتا بھی نہ ہو گا اور میری عمر ہی کیا تھی۔ مگر اس وقت تو زہرہ چھوٹی لڑکی نہ تھی، جوان تھی اور جوان بھی ایسی جوان! اور کھڑی تھی تو ایسی تمکنت اور غرور کے ساتھ! نہ اس کی آنکھ میں منت تھی اور اس کے انداز میں سائلانہ پن۔ کھڑی ہوئی شہزادی لگتی تھی۔ برقع پہنے ہوئے تھی اور اُسے ایک ہاتھ سے اُٹھائے آگے کے آدھے جسم کو چھپائے ہوئے تھی۔ برقعے بھی لاکھوں ہی عورتیں پہنتی ہیں مگر وہ برقع کی پہبن بھی کسی میں نہ ہو گی۔ اس کی وہ تصویر میرے دماغ پر نقش ہے اور جس نظر سے وہ محبوب کو دیکھ رہی تھی، وہ فقط دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ شوق اور آگ، مجھے تو ان دو کا احساس ہو رہا تھا!

میں تو کیا کہتا، اور محبوب کے لئے فوراً کچھ کہنا ناممکن تھا۔ کیونکہ ایسا موقع کبھی ہمارے خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ میرے لئے تو کچھ کہنا نامناسب چھوڑ بالکل ہی بے محل تھا اور ابھی تک زہرہ کو شاید میری موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ اور دراصل اگرچہ بیان کرنے میں مجھے وقت لگے۔ زہرہ کو آئے ابھی شاید ایک منٹ سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، اگرچہ ہمیں اتنا وقت بھی ایک مدت معلوم ہو رہا تھا۔ میں تو شاید کچھ کہتا ہی نہیں، محبوب ہی نے یہ سکوت توڑا اور گھُٹی ہوئی آواز میں کہا "خدا کے لئے، یہاں کیوں آئی ہو" اور جب زہرہ چپ رہی تو پھر محبوب نے اور بھی سوکھے منہ سے کہا "اگر کوئی دیکھ لے تو کیا ہو گا؟" میں نے دیکھا کہ اس پر زہرہ مسکرائی اور ایک قدم اور اندر آ گئی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ محبوب اور گھبرایا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا

ہُوا۔ مگر زہرہ کی موجودگی ہی اتنی مسحور کن تھی کہ ہم دونوں یہ محسوس کر رہے تھے کہ گویا ہم بے بس ہیں۔ جب محبوب کے دوبارہ کہنے پر بھی زہرہ نہ مُڑی تو محبوب ایسا گھبرایا کہ اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا، ہاتھ کانپنے لگے اور فقط میز کا سہارا لے کر کھڑا رہ سکا۔ آخرکار زہرہ نے کہا اور اس کی آواز تھی، کیا بتاؤں تمہیں کتنی پرسرور تھی! (یہاں میں نے دیکھا کہ ممتاز نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لیتے لیتے اپنے آپ کو روک لیا۔ اور وہ آدھے منٹ تک خاموش بھی رہا۔ میں نے باقیوں کی طرف دیکھا سبھی اس حکایت سے متاثر ہو رہے تھے ہیں کچھ حیران بھی ہُوا کیونکہ احسن عام طور پر دوسروں کے جذبات سے کم متاثر ہوتا ہے)

ممتاز نے پھر سلسلہ کو جاری کرتے ہوئے کہا "میرے تو اوسان بجا نہ تھے اور نہ میری کوئی حیثیت تھی۔ میں تو زہرہ کو محبوب کے ذریعہ سے جانتا تھا مگر وہ نہ مجھے جانتی تھی اور نہ اس نے ایک نظر سے بھی ظاہر کیا کہ اس نے مجھے دیکھا ہے۔ اس کی تمام توجہ محبوب کی طرف تھی اور وہ زیرِ لب مسکراہٹ سے اُس کی گھبراہٹ سے لطف اُٹھاتی معلوم ہوتی تھی۔ جو اس نے کہا وہ یہ تھا "اب شکایت پھر کروگے کیا؟"۔ محبوب اس پر کیا کہتا۔ ندامت اور سراسیمگی کی وجہ سے ساکت کھڑا رہا۔ مگر زہرہ کے الفاظ طعنہ آمیز نہ تھے اور نہ ان میں شکایت تھی، محض ان مسکراہٹ میں لپٹے ہوئے الفاظ سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ محبوب پر ہنس رہی ہے۔ محبوب نے جواب میں کہا "نہیں" مگر اتنی مٹی ہوئی آواز میں کہ میں بمشکل ہی سُن سکا۔ زہرہ نے پھر کہا "گلیوں میں رومال یونہی اُگا کرتے ہیں؟" محبوب نے اس کا تو کوئی جواب نہ دیا مگر ایک دم اور ایک ہی سانس میں یہ کہا "خدا کے واسطے زہرہ یہاں سے چلی جاؤ، کوئی اندر سے آ گیا تو میں کیا کروں گا؟" زہرہ نے کہا "مجھے کیا معلوم؟" مگر اس لاابالی آواز سے کہ محبوب نے مجبور ہو کر کہا "تو پھر کیا چاہتی ہو؟"

زہرہ نے جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔ میں تو تمہارے ہاں خالہ اماں سے ملنے آئی ہوں، میری اماں پہلے کی آئی ہوئی ہیں"۔ محبوب نے کہا "تو پھر یہاں کیا کر رہی ہو، خدا کے لئے اب چلی جاؤ، اماں تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی"۔ زہرہ نے کہا "کرتی رہیں"۔ اس پر محبوب بچارے نے تنگ آ کے اور بے بس ہو کے کہا "تو میرا قصور ہے زہرہ، خدا کا واسطہ ہے، اب جاؤ۔ میں پاگل ہو جاؤں گا، یہاں تم کر ہی کیا رہی ہو؟" زہرہ اب بھی چُپ رہی۔ محبوب کی حالت غیر تھی۔ اسے ایک تو یہ ڈر کہ دروازہ کھلا ہے کوئی آ نہ جائے اور کوئی آوازیں نہ سُن لے اور ایک یہ کہ زہرہ کو اب باہر کون نکالے۔ اس نے جس طرح بھی ہو سکا پہلے کواڑ تو بند کئے۔ میرے سکرے کی طرف نگاہ ڈالی، میں اب اور اندھیرے میں تھا بلکہ تقریباً ایک کواڑ کی اوٹ میں تھا۔ بہرحال اگر زہرہ کو پتہ بھی تھا کہ میں وہاں ہوں، پھر بھی اس نے مطلقاً ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کے اور محبوب کے سوا کوئی اور وہاں موجود ہے۔ میرا تو اس کے نزدیک دُنیا میں وجود ہی نہیں تھا۔

"جب محبوب پھر واپس اس سے التجا کرنے آیا کہ وہ چلی جائے تو اس نے پوچھا "اب چھت پر نہیں جاتے؟" محبوب نے

حیران ہو کر کہا "نہیں"۔ زہرہ نے پوچھا "کیوں؟" محبوب اس پر کچھ جھنجھلایا۔ اس نے کہا "اب گرمیاں آتی جا رہی ہیں، مگر تمہارا ان سوالوں سے کیا مطلب ہے؟ اگر تم نہیں جاتیں تو میں ضرور چلا جاتا ہوں"۔

زہرہ نے کہا "چلے جاؤ"۔ مگر وہ خود اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ مجھے محبوب کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ ایک تو وہ ایسا احساس جیسے چھوئی موئی کا پودا اور پھر یہ انہونی اور ناممکن سی صورتِ حال۔ وہ ہار کے ایک کرسی سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ زہرہ نے کہا "آیا کرو گے اب اوپر؟" محبوب بیچارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

زہرہ نے پھر پوچھا "لوگوں کے وہاں اب یونہیں چھوڑ جایا کرو گے؟" اس پر محبوب پہلے تو کوئی جواب نہ دے سکا۔ مگر زہرہ کے دوبارہ "کیوں؟" کہنے پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ زہرہ نے کہا "اچھا ایک اور بات، اس کرسی پر تم کیوں نہیں بیٹھتے؟" اور میری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ محبوب اس سوال کا کیا جواب دیتا۔ اس نے پھر کہا "اب تو جاؤ۔ میں منت کرتا ہوں، اب ضرور چلی جاؤ۔ مجھے کیوں اتنی تکلیف دیتی ہو؟" یہ آخری الفاظ اس نے اتنی پُردرد آواز میں کہے کہ زہرہ بھی ضرور منفعل ہوئی ہو گی، مگر اس نے پھر یہی کہا "بیٹھو گے؟" محبوب نے بہت عاجزی سے کہا "اچھا! لو اب تو جاؤ"۔ زہرہ نے اس کے جواب میں جو بات کی اور جس انداز میں کی وہ شاید کبھی نہ بھولے۔ اب تک تو وہ کھڑی تھی اب ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک خاص اپنے ہی لہجے میں کہا "ہم تو نہیں جائیں گے"۔ مجھ پر جو ان الفاظ اور اس بے ساختہ ادا کا اثر ہوا، اس کا تو ذکر ہی کیا، مگر محبوب بیچارے کا تو رنگ سفید ہو گیا اور جہاں کھڑا تھا وہیں کرسی پر یوں تھپ سے بیٹھ گیا جیسے اس کی ٹانگیں اسے جواب دے چکی ہیں۔ میں بہت پریشان ہوا اور مجھے فکر بھی بہت ہوئی مگر قبل اس کے کہ میں کچھ کر سکوں، زہرہ وہاں سے چلی گئی۔ کس طرح گئی اور کب یہ میں ٹھیک نہیں جان سکا۔ تمام کیفیت ہی ایک خواب سی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کسی خمار میں آدمی تصویریں دیکھ رہا ہو۔ مجھے تو اپنے حواس پر یقین نہیں آتا تھا۔ جو بات مجھے قطعی طور پر یاد ہے وہ یہ کہ محبوب بیچارا میز پر بازو پھیلائے ان پر اپنا سر رکھے رو رہا تھا۔"

ممتاز چپ ہو گیا۔ ہم میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس سے کوئی سوال کر سکیں۔ نظریں نیچی کئے وہ ایک منٹ تک یونہی خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھا کے ہم سب کو ایک نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد خود ہی اس نے اپنی کہانی جاری کرتے ہوئے کہا "اس واقعہ کو پندرہ سال ہو گئے ہیں اور میں نے کتنی ہی دفعہ اس کے متعلق سوچا ہے۔ مجھے اکثر یقین نہیں آیا کہ یہ سب کچھ ایسے ہی ہوا۔ بلکہ زہرہ کے چلے جانے کے بعد ہی مجھے اپنے آپ پر اعتبار نہیں آتا تھا۔ مگر زندگی میں عجیب عجیب واقعات پیش آتے ہیں"۔ یہ کہہ کے وہ پھر خاموش ہو گیا بلکہ مجھے محسوس ہوا کہ اب اس کے بیان میں روانی نہیں تھی۔ رُک رُک کے اور ٹھہر ٹھہر کے جیسے اپنی مرضی کے خلاف ہمیں یہ سب سنا رہا تھا۔ بلکہ کبھی تو مجھے خیال آتا کہ ہمیں سُنا نہیں رہا۔ آواز کی مدد سے سوچ رہا ہے۔

پھر اُس نے کہا۔ "اس کے بعد میں نے دیکھا کہ محبوب کا انداز کچھ بدل گیا۔ کبھی تو اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے

زہرہ سے بے حد نفرت ہے اور کبھی مجھے شک ہوتا تھا کہ وہ ایک زبردست کشش سے زہرہ کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ کبھی تو وہ چھت پر جاتے وقت زہرہ کو بہت کوستا اور کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ وہ بے چین ہو کر، بے اختیار اُٹھ کے اوپر چلا جاتا۔ اوّل اوّل تو وہ مجھے بُنت اوپر ساتھ لے جاتا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد معلوم نہیں کیوں، اس نے مجھے مجبور کرنا چھوڑ دیا۔ شاید میری پڑھائی کے خیال سے یا اگر وہ مجھ سے چھپاتا کچھ نہ تھا۔ اور نہ وہ زیادہ روشن دان کے سامنے والی کرسی ہی پر بیٹھتا۔ اور نہ وہ بہت زیادہ اوپر ہی جاتا۔ ان حالات میں جو پڑھائی مجھ سے ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے۔

"زہرہ نے اور ستم جو کرنا شروع کیا وہ یہ کہ روشن دان چھوڑ، روشن دانوں کے ذریعہ سے کنکروں پر لپٹے ہوئے اور دھاگے سے بندھے رقعے بھیجنے شروع کئے۔ سامنے والے مکان میں آجاتی اور رقعہ پھینک کے چلی جاتی یا وہیں ہنستی کھیلتی رہتی۔ اس کی ہنسی کی آواز تو میں اکثر بیٹھا بیٹھا سنا کرتا۔ روشن دانوں کا جو حال ہو گا وہ بھی ظاہر ہے۔ کوئی روشن دان ایسا نہیں تھا جس کے دو ایک شیشے نہ ٹوٹے ہوئے ہوں۔ اور اب محبوب بھی ان کی مرمت نہ کراتا اور نہ کسی سے شکایت کرتا۔ رقعے فقط اس دن آتے جب محبوب اوپر چھت پر نہ جاتا اور ان پر فقط یہ لکھا ہوتا "آج آپ اوپر نہیں آئے"۔ یا "آج آپ ایک منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے"۔

"محبوب کو اب یہ ڈر رہنے لگا کہ کوئی روڑا اندر آنے کی بجائے اگر باہر گلی میں گر پڑے اور کوئی اُٹھا لے تو کیا ہو؟ میں اسے بہتیری تسلی دیتا کہ بھئی وہ خود خیال رکھتی ہو گی۔ اگر ایسا ہو جاتا ہو گا تو فوراً اُٹھوا منگواتی ہو گی۔ وہ بھی کہتا "اسے کیا پروا ہے اسے کیا؟" یہ نئی پریشانی اس کی اور بھی بڑھنے لگی جب وہ اپنے رقعے، جن پر عبارت ہمیشہ مختصر ہی ہوتی، چھت پر بھی پھینکنے لگی۔ جس دن محبوب کو چھت پر پہلا رقعہ ملا ہے میرے امتحان میں چار دن تھے۔ اس لئے میں اس پر بہت زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ میرے امتحان کے اختتام تک چھت پر کوئی رقعہ نہ آیا کیونکہ محبوب بیچارے نے مجبور ہو کر زہرہ کو نہایت لجاجت سے یہ خط لکھ پھینکا تھا کہ خدارا رقعے نہ پھینکا کرو اور اگر میرے کہنے کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا تو کم از کم اوپر چھت پر تو نہ پھینکا کرو۔ اگر کوئی روڑا اندر صحن میں یا جا گرے، یا کسی اور پڑوسی کے مکان میں جا گرے یا کوئی اوپر ہی گرتا اور مجھے اُٹھاتے دیکھ لے تو کیا ہو؟ کیوں میری جان کی دشمن ہوئی ہو؟" اس کا جواب تو زہرہ نے کچھ نہ دیا، البتہ جب تک میں وہاں رہا۔ اس نے اوپر چھت پر کوئی رقعہ نہیں پھینکا۔ افسوس کہ مجھے محبوب کے ہاں سے بہت جلد اور غیر متوقع طور پر گھر جانا پڑا۔ اگرچہ محبوب بہت منتیں کرتا تھا کہ میں اور کچھ عرصہ رہوں اور میں خود نہیں جانا چاہتا تھا مگر گھر سے خط پر خط آ رہا تھا کہ امتحان کے ختم ہوتے ہی گھر آؤ۔ اماں بیمار ہیں۔ افسوس اگر میری والدہ ان دنوں بیمار نہ ہوتیں تو محبوب آج زندہ ہوتا!"

یہاں پھر ممتاز کچھ دیر خاموش رہا۔ اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس جسے وہ خود بھی نہ روک سکا، بھر کے کہا "جانے سے ایک دن پہلے اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر زہرہ کا کوئی رقعہ اماں کے ہاتھ یا کسی اور کے ہاتھ آ جائے تو میرے لئے خودکشی

کے سوا اور کیا ہے !" میں سمجھا یونہی جوش میں بے سمجھے بات کر رہا ہے ۔ میں بھی بھول گیا کہ وہ ہے ہی اتنا نازک مزاج کہ ذرا سی چیز سے اس کی طبیعت میں عجیب فرق آجاتا ہے ۔ اور اس کے حساس ہونے کے متعلق تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں ۔ شرم اسے اس بات سے بھی آتی تھی کہ اماں کو پتا لگ گیا تو کیا کہیں گی کہ کل تو ان لڑکیوں کی شکایت کرتے تھے اور اب !"

" اس کے بعد میں گھر چلا آیا ۔ مگر مجھے بہت تشویش رہی ۔ ہر روز محبوب کے خط کا انتظار کرتا ۔ آنے کے ساتویں آٹھویں روز بعد جو خط مجھے ملا اس میں بہت سراسیمگی کی حالت میں لکھا تھا کہ "جس چیز سے میں ڈرتا تھا وہی ہوگئی ہے ۔ زہرہ کا ایک خط مجھے نہیں ملا ۔ اس نے جواب مانگا ہے ۔ مجھے معلوم ہی نہیں کس چیز کا جواب دوں ۔ ہر طرف ڈھونڈتا ہوں اس کا خط نہیں ملتا کسی کے ہاتھ نہ آگیا ہو " اس کے تیسرے چوتھے روز ہی محبوب کے والد کا خط مجھے ملا کہ محبوب کا اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا ہے ۔ میں لاہور پہنچا تو وہ اسے دفنا چکے تھے ۔ ان کے ہاں گیا ۔ اِدھر اُدھر کھڑکیوں کی طرف میں نے نظر دوڑائی ، وہاں کوئی نہ تھا ۔ محبوب ہی اب نہ تھا ۔ وہاں کیا ہوتا !"

ہم میں سے کسی کو اس سے سوال کرنے کی جرأت نہ ہوئی ۔ مگر احسن نے کچھ عرصہ بعد پوچھ ہی لیا : " اور عشق ؟"

ممتاز نے اس کی طرف ایک ملامت آمیز نظر سے دیکھا مگر کچھ جواب نہ دیا ۔

سید فیاض محمود

دُنیا میں جنت

خوش گوار آب و ہوا ، دلکش نظارے ، فراخ ہوا دار مکان ہر ایک کے رہنے کو ،

صاف ستھرے کپڑے ہر ایک کے پہننے کو ،

کافی مقدار میں صحت بخش غذا ہر ایک کھانے کو ،

کوئی مناسب کام ہر ایک کے کرنے کے لئے ،

ہر شخصیت کو اپنی صحیح نشوونما کا موقع ،

طبیعتیں سُدھری ہوئی ، خوشی ، محنت ، استقلال ، جدت کی تصویر ،

اگر یہ سب کچھ بہم ہو تو پھر اور کیا درکار ہے ؟

پھر دُنیا ہی میں جنت ہے !

ب ۔ ل

جامِ زندگی

(۱)

مری آتش نوائی نے لگائی آگ لالوں میں
مرے نغموں سے دوڑی لہر مستی کی غزالوں میں

فرشتے آسمانوں پر جگر کو تھام لیتے ہیں
سمائی ہے محبت آگ بن کر میرے نالوں میں

جلا کر راکھ کر دیتا ہے باطل کو سخن میرا
کہ حق کی بجلیاں خوابیدہ ہیں میرے خیالوں میں

مرے اشعار مریخِ فلک کے تیر خنجر ہیں
ہے پنہاں زندگی کا مادہِ کامل ان ملاہوں میں

سخن میں روح و جاں ہے عشق کی گرمی و مستی سے
اسی سیّال آتش کو میں بھرتا ہوں پیالوں میں

ترقی و تنزّل ہے عمل کی رفعت و پستی
یہی نکتہ ہے قوموں کے عروج اور زوالوں میں

سخن میرا عمل میرا ہی جس سے آرزو یہ ہے
کہ روحِ زندگی پھونکوں وطن کے نونہالوں میں

وطن کے نونہالوں کے لئے پیغام لایا ہوں
میں ان تشنہ لبوں میں زندگی کا جام لایا ہوں

(۲)

جوہلو! زندگی انساں کی ہی دریائے طوفانی
نہ کام آئے گراں خوابی نہ کام آئے تن آسانی

تھپیڑوں پر تھپیڑے ہیں وہ دریائے حوادث کے
سمندر کی چٹانوں کا بھی زہرہ جن سے ہو پانی

دلِ بیباک و چشمِ پاک اِس دریا کی کشتی ہیں
بچا لیتی ہے طوفانوں میں جو ناموسِ انسانی

جہاں کی کشمکش فکر و عمل کا مہر روشن ہے
اسی میزان میں تُلتا ہے بختِ آدمِ فانی

جو ہمت میں جواں ہیں بخت ہے دائم جواں اُن کا
قدم لیتا ہے آکر ان کے تخت و تاجِ سلطانی

جوانمردوں کی ہمت کے یہ سب ادنے کرشمے ہیں
جہانگیری، جہانداری، جہاں بینی، جہانبانی

جوانمردوں کے خونِ گرم کی زرّیں شعاعیں ہیں
بہائے کشورِ جمشیدی و ملکِ سُلیمانی

مرے شیرو! جوانمردی کے جوہر سے کرو پیدا
سروں میں فتح کا سودا، دلوں میں نُورِ یزدانی

بچو اس زہر سے "تہذیبِ مغرب" جسکو کہتے ہیں
عناصر جس کے ہیں جام و قمار و رقص و عُریانی

اسی نے چھین لی ہے نوجوانوں کی جوانمردی
اسی سے صنفِ نازک کی لُٹی ہے رُوحِ نسوانی

ہوا ہے مسخ انساں علم و تہذیب و تمدّن سے
ہے دَورِ علم و تہذیب و تمدّن دَورِ شیطانی

کیا نامرد انسانِ مہذّب کو تمدّن نے
کدھر ہے مردِ صحرائی و کوہی و بیابانی؟

دلوں میں نورِ ایماں ہو تو آنکھوں میں نہیں جچتی
یہ جمشیدی یہ دارائی یہ فغفوری یہ خاقانی

اگر تم سے کوئی پوچھے کہ رُوحِ زندگی کیا ہے؟
تو کہہ دو اُس سے قُربانی ہے قُربانی ہے قُربانی

جہاں میں رُوحِ قُربانی سے قومیں زندہ ہوتی ہیں
رُخِ خورشیدِ خاور کی طرح تابندہ ہوتی ہیں

محمد اکبر منیر

م۔ک۔ن۔ب

انگریزی رسالے "ٹرو سٹوری" میں ایک مستقل عنوان I. N. F. (I'll never forget) قائم کیا گیا ہے۔ جس کے ماتحت رسالۂ مذکور ایسے سچے مختصر واقعات شائع کرتا ہے جو قارئین کے ذہن میں شب و روز کی گردشوں کے بعد بھی محفوظ رہے ہوں اور جن سے اُن کی زندگی ایک بڑی حد تک متاثر ہوئی ہو۔ یہ واقعات سنجیدہ ہوں یا مزاحیہ ہر قسم کی قیود سے آزاد ہوتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ حقیقت پر مبنی ہوں! میری یہ خواہش ہے کہ "ٹرو سٹوری" کے تتبع میں "م۔ک۔ن۔ب" یعنی "میں کبھی نہ بھولوں گی" کا مستقل عنوان گرانپایہ "ہمایوں" میں بھی قائم کیا جائے۔ اس عنوان سے جہاں ادب میں ایک نئی صنف کا اضافہ ہوگا وہاں ہندوستانی معاشرت پر بھی بہت کچھ روشنی پڑے گی۔ اور کیا دُور ہے کہ مُصلحین ان ٹھوس واقعات کی بنا پر اپنی قومی اور مُلکی مشکلات کا کوئی حل بھی سوچ نکالیں! اگر اس سے زیادہ فائدہ نہ ہُوا تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ کم از کم یہ تو ہوگا کہ سانحہ نگاری کا شعبہ ترقی کرے گا اور بلند معیار کی افسانوی لذت حاصل ہو سکے گی کیونکہ "حقیقت افسانہ سے بھی زیادہ جاذب اور دلچسپ تر ہوتی ہے۔"

طالب

میں کبھی نہ بھولوں گا وہ واقعہ جو مجھے ایک شام ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے پیش آیا۔

سرما کا آغاز تھا! مجھے سکول میں شام کی جماعت کو پڑھانے کے بعد ایک اور لڑکے کو اُس کے گھر پر پڑھانے کے فرائض تفویض ہوئے تھے۔ جہاں سے میں رات کو دس بجے فارغ ہوتا تھا۔ پیسہ بُری بلا ہے۔ مَیں نے درمیانی وقفے میں، جو صرف پون گھنٹہ کا تھا، بجائے گھر جانے کے ایک اوسط درجہ کے ہوٹل میں طعام کا بندوبست کر لیا تھا!

ایک شام، جب ابھی رات کی سیاہی مکمل طور پر شفق کی رنگین روشنی پر غالب نہ آئی تھی، مَیں ہوٹل کی ایک بوسیدہ و کہنہ میز کے پیچھے لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا۔ بچپن میں خاندان نے اچھے دن دیکھے تھے اس لئے حوصلہ وسیع تھا اور تین چار خاص طور پر تیار کئے ہوئے کھانے بھی، جن کو ہوٹل والوں کی اصطلاح میں "اسپیشل" کہتے ہیں تھال میں چُنوا لیا کرتا تھا۔ ان سبزیوں اور بھاجیوں کی قیمت ایک آنہ فی طشتری کے حساب سے علیحدہ ہوتی تھی!

"گوبھی" کے پھول ابھی بہت گراں تھے۔ اُس شام مَیں نے ایک طشتری گوبھی کی بھی منگوائی اور مزے سے کھانے لگا!

جس وقت میں کھانوں کی لذت کے احساس میں محو تھا یا شاید اَور خیالات میں کھویا ہُوا تھا، میری آنکھوں کے سامنے ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا۔ مَیں نے اُس وقت اِس کی طرف بہت کم توجہ دی۔ لیکن مجھے اُس سارے واقعہ کا علم آغاز سے

انجام تک ہے جس طرح کوئی بات ہمارے تحت الشعور میں واقع ہو رہی ہو!

ایک کمسن لڑکی، جس کے لباس اور چہرے پر ناداری کے نقوش کندہ تھے، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کٹورا اور دو پیسے لے کر تیتری کی سی شوخی کے ساتھ پھدکتی ہوئی آئی! وہ کسی غریب ماں کی غریب بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ بچوں کی سی شرارت اور شوخی کے ساتھ اُس نے کہا ـــــ "مجھے دو پیسے کی گوبھی کی بھاجی دو!"

ہوٹل کے تُرش رو مالک نے، جو اکثر پان کی جگالی کرنے کا عادی تھا، کتھے سے رنگی ہوئی پیک پھینکتے ہوئے کہا۔ "دور جاؤ! گوبھی ایک آنہ میں آتی ہے"۔

لڑکی نے ایک لمحہ انتظار کیا اور پھر للچائی ہوئی نظروں کے ساتھ اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میری ماں نے مشکل سے دو پیسے دیئے ہیں تھوڑی ہی دے دو"۔

ظالم دکاندار نے مطلق پروا نہ کی۔ بڑے زور سے "نہیں" کہا اور دیگر گاہکوں سے قیمت وصول کرنے میں مشغول ہو گیا! معصوم لڑکی دم بخود کھڑی رہی اور میرا خیال ہے کہ اُس نے دو منٹ تک کھڑے رہ کر ہوٹل کے مالک اور گوبھی کے پتیلے کی طرف حسرت کی نظر بھی ڈالی تھی اور پھر آہستہ آہستہ وہ دکان سے باہر نکل کر بازار میں چلی گئی!

میں اُس وقت کھانا ختم کر چکا تھا اور میرا خیال ہے کہ جب میں ہاتھ دھو رہا تھا اُس لڑکی نے ہوٹل کی طرف پُشت کی تھی معاً میرے دل میں خیال آیا کہ میں اسے دو پیسے اپنی جیب سے دے کر گوبھی لے دُوں گا۔ تاکہ معصوم بچی کے دِل کو تسکین ہو اور اِس خیال سے میں جلدی سے پیسے دے کر اُس لڑکی کے پیچھے دوڑا ـــــ لیکن ـــــ لیکن وہ گزرے ہوئے موقع کی طرح بازار کے ہجوم میں گُم ہو چکی تھی!

نزدیک کے چوک میں پہنچ کر ـــــ کیونکہ میں نے اُسے یقیناً چوک ہی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا ـــــ میری نظروں اور میری ٹانگوں نے جلدی جلدی اُس کی بہت تلاش کی لیکن بے سُود! میں نے فوراً واپس لوٹ کر ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔ "کیا تم اُس لڑکی کو جو ابھی یہاں دو پیسے کی گوبھی مانگتی تھی جانتے ہو؟" اُس نے کہا "نہیں! ایسے کئی لوگ یہاں ہر روز آتے ہیں"۔ اُس کو معلوم نہ تھا کہ اُس کے اس جواب نے میری تڑپتی ہوئی بیمار اُمیدوں کو برف کی قبر میں اُتار دیا!

میں نے پھر ایک آخری کوشش کی اور چوک سے پھٹنے والے تین راستوں کو پُوری رفتار کے ساتھ دو دو فرلانگ تک دیکھا لیکن وہ لڑکی نہ ملنی تھی اور نہ آج تک ملی ہے!

سانپ نکل گیا تھا اور میں اُس کی لکیر کو پیٹ رہا تھا!

خُدا نے مجھے ایک معصوم رُوح کو چند ثانیہ کے لئے صرف دو پیسوں میں خوش کرنے کا موقع دیا تھا لیکن میں اپنے لذیذ

کھانوں میں مشغول رہا۔ میں اب محسوس کرتا ہوں کہ میں فرعون سے بھی زیادہ مغرور، اور نیرو سے بھی زیادہ ظالم اور سنگدل ہوں، میں نے اُسی وقت کیوں نہ اُسے بھاجی لے دی؟ کیا میں لڑکی کو آواز دینے کے بعد ہاتھ نہ دھو سکتا تھا؟

اس واقعہ کو تین سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس دوران میں مَیں نے فقراء اور غرباء کی کئی معصوم بچیوں کو روٹی، مٹھائی، بسکٹ اور پھل لے کر دیئے ہیں لیکن میری رُوح کو تسکین نہیں ہوتی۔ کانٹا نکل گیا ہے لیکن اس کی کسک ابھی باقی ہے اور شاید وقت کا طبیب بھی اسے شفا نہ دے سکے گا!

جب کبھی میں اپنی بچیوں کو دیکھتا ہوں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اُن میں ہوٹل والی اُسی معصوم صورت کو دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ اگر خُدا کی مرضی سے میری مَوت آج ہی واقع ہو جائے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی میری معصوم بچی بھی، جو لازمی طور پر ایک غریب بیوہ کی آنکھوں کی روشنی ہوگی، بالکل اُسی ہوٹل والی لڑکی کی طرح کسی جگہ سے بے نیلِ مرام واپس لَوٹ سکے!

اِس بھیانک خیال کے آتے ہی میں سیماب کی طرح بے قرار ہو جاتا ہوں۔ میرا سکون منتشر ہو جاتا ہے۔ میرے عیش و آرام کی دُنیا میں زلزلہ آجاتا ہے اور اگر تنہائی ہو تو میری چیخ بھی نکل جاتی ہے!

کیا خدا اُسی لڑکی کو، اُسی گزری ہوئی شام میں، اُسی ہوٹل پر، اُسی طرح تتلی زبان سے گو بھی مانگتے ہوئے پھر پیش کر سکتا ہے؟ "خدا سب کچھ کر سکتا ہے" عقیدت اور ایمان سے بھرے ہوئے اس نظریہ کو میں مذہب کے محتسبوں کے خوف سے تسلیم کر لیتا ہوں لیکن اے ہمنشیں! مَیں خود تو خدا کو بھی اس بات میں بے طاقت سمجھتا ہوں!

گیان چند طالب
ایم۔اے

جاؤ اور اپنے لئے کوئی کام تلاش کرو اور اُسے مستعدی سے کر دکھاؤ کہ رات آیا چاہتی ہے اور پھر کوئی شخص بھی کچھ نہ کر سکے گا!

ہمیں چاہئے کہ ہم انسانی اداروں کو انسانی فطرت کے مطابق بنائیں۔ موجودہ طریقہ جس سے ہم انسانی فطرت کو فضول توہمات اور خود غرضانہ مفاد کے سانچے میں زبردستی ڈھال رہے ہیں وہ تباہ کُن طاقت پیدا کرتا ہے جس سے تمدن بالآخر برباد ہو جاتا ہے۔

گلچیں

غزل

چمن شگفتہ بہ پیرایۂ بہار تو ہو
فریبِ دید سہی جلوہ آشکار تو ہو

رہے شکار ربطِ مے کا، سبزہ زار تو ہو
کنارِ جُو، شبِ مہ، موسمِ بہار تو ہو

اُمید پر شبِ ہجراں کی سختیاں سہہ لوں
مگر تمہارے کسی قول کو قرار تو ہو

ہلاکِ کشمکشِ التماس ہے حسرت
خفا ہی یار تو ہو، مہرباں ہے یار تو ہو

سلگ سلگ کے ہوا خاک خرمنِ دل و جاں
پھر آج برقِ تبسم ہے بیقرار تو ہو

فسانۂ بیکسیٔ شوق کا سنائیں انہیں،
کہیں خموش چراغِ سرِ مزار تو ہو

نشان اس سے ہی ہم اس کا پوچھتے لیکن
کبھی نظر تو وہ آئے کہیں دوچار تو ہو

تجھے خبر ہی نہیں زاہدِ فرشتہ خصال
کرم ہے عام کسی کا گناہ گار تو ہو

رہے تو پردہ شہیدانِ دشتِ غربت کا
کفن نہیں، نہ سہی، چادرِ غبار تو ہو

بلا سے وعدۂ فردا کا امتحاں ہی سہی،
کسی طرح سحرِ شامِ انتظار تو ہو

غزل ہی کیا جو نہ ہو ترکشِ خدنگِ اثر
شبیہ شعر وہی ہے جو دل کے پار تو ہو

شبیہ زیدی

غزل

حقیقت کیا ہے اس دُنیا کی اک افسانۂ باطل،
نظر آتا نہیں اس بحرِ ظلمت کا کوئی ساحل

ابھی تک یادگارِ گرمیٔ محفل ہے دل میرا
ابھی تک دیدنی ہے رقصِ بیتابانۂ بسمل

ستم پردازیٔ بختِ زبوں پہلے ہی کیا کم تھی
کہ اس میں ہو گئی بے مہریٔ احباب بھی شامل

نہالِ آرزو کو خونِ دل سے سینچنے والے
نہیں جز جنسِ حرماں شورزارِ دہر کا حاصل

نہیں ہوں واقفِ آدابِ اُلفت وائے محرومی
نہیں ہوں میں ابھی تیرے حریمِ ناز کے قابل

نہیں ہے خاک بھی مجھ آشیاں برباد کی باقی
مگر گلشن پہ اب تک ہو رہی ہیں بجلیاں نازل

مثالِ طائرِ پرسوختہ قسمت کو روتا ہوں
نہیں ہوں تیرِ زہر آلودۂ صیاد سے غافل

الٰہی دشت پیمائے محبت کی خبر لینا
ہزاروں ہفتخواں ہیں منزلِ مقصود میں حائل

ازل سے ہیں رہینِ گردشِ قسمت ہوئے اے تائب
مجھے اے کاش کر دیتے غبارِ جادۂ منزل

(ملک) مراتب علی خاں تائب

اُلٹ پھیر

(۱)

سبھدرا اب شادی کے قابل ہوگئی ہے۔جلد ہی کہیں بات ٹھیک ہونا چاہیے۔چار بھائیوں میں ایک ہی بہن ہے! اس پر ماں بھی دو سال کی چھوڑ کر چلی گئی۔ رادھا کانت نے بڑے ناز و نعم سے پرورش کی ہے۔منتوں سے مانگی ہوئی بیٹی کو کیسا گھر ملے گا؟ محبتِ مادری سے محروم سبھدرا کو کس کے ہاتھ میں دینا ہوگا؟ اسی فکر میں انہیں نہ دن میں چین آتا ہے نہ رات میں نیند آتی ہے۔

آج سال بھر ہوا نائی اور برہمن دیس دیس کی خاک چھان رہے ہیں۔لیکن کہیں گھر ملتا ہے تو بر نہیں اور بر ملتا ہے تو گھر نہیں اور اگر اتفاق سے گھر اور بر دونوں اچھے ملے تو بر کا باپ چاہتا ہے کہ لڑکے کے برابر کوئی سونا تول دے۔

سبھدرا کے لئے رادھا کانت وہ بھی کر دیتے لیکن چار لڑکے ہیں انہیں بھیک کیسے منگوائیں؟ دنیا کیا کہے گی؛ بڑے بننے پر بھی دولت کی ایک حد ہوتی ہے۔

ایک دن رادھا کانت نے اپنے بیٹوں کو بلا کر کہا ——— "بھائی۔اب نائی برہمن سے کام نہیں چلے گا۔سال ختم ہونے کو آیا لیکن بات پکی نہ ہوئی۔میری یہ ضد نہیں کہ سبھدرا راجا ہی کے گھر جائے لیکن ایسا گھر تو ہو کہ بیٹی دے کر اطمینان کی سانس لے سکوں۔تم لوگ خود کوشش کرکے دیکھو۔اگر اس سال بیساکھ میں سبھدرا کی شادی نہ ہوئی تو مشکل اور طول پکڑ لے گی۔پھر میری زندگی کا بھی کیا بھروسا! ندی کنارے کا پیڑ۔جب تک کھڑا ہے۔کھڑا ہے۔"

باپ کی دلی تکلیف کو چاروں بھائیوں نے محسوس کیا۔سبھدرا کے واسطے بر کی جستجو کرنے لگے۔شہر میں دیہات میں جہاں بھی کوئی ذریعہ ملا۔خود جاکر بات کی۔جہاں کہیں کسی رئیس کا پتہ چلا، وہاں جا پہنچے۔

ایک جگہ کوشش کرنے پر معلوم ہوا لڑکا تعلیم یافتہ نہیں ہے۔"خیر۔رئیسوں کے لڑکے ایسے ہی ہوتے ہیں۔لڑکی کو دولت کا آرام تو ملے گا۔" دوسری جگہ لوگوں سے شکایت سنی بڑا بخیل خاندان ہے کسی کو بدن کا میل بھی نہیں دیتا۔"اس میں کیا برائی ہے دولت اس طرح بڑھتی ہے۔اولاد تو سکھ کرے گی۔" ایک جگہ اور گئے۔معلوم ہوا لڑکے کا باپ حد درجہ کا بدمزاج ہے۔" اجی۔باپ کیا ہمیشہ بیٹھے رہتے ہیں" لڑکے کی ماں نہیں ہے۔"ہرج کیا ہے؛ گھر کی مالکن لڑکی بنے گی"۔ مکان اچھا نہیں ہے۔"بھائی سب چیزیں حسب منشا ملنا تو مشکل ہیں۔جہاں اچھے لوگ ہیں وہی اچھی جگہ ہے۔" یہاں تک کہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوکر کہ

لڑکا آوارہ ہے ایک بار لڑکے کے باپ سے بات کرلی گئی۔ لیکن سب محنت مشقت بیکار رہوئی۔

جو کوئی واپس لوٹتا۔ سوکھا مُنہ لے کر ہی آتا۔ ایسی ویسی جگہ کی بات بھی کوئی کرتا تو رادھا کانت کا دل گواہی نہ دیتا۔ جان بوجھ کر سبھدرا کو غار میں کیسے دھکیل دیں؟

لڑکے میں چاہے کوئی صفت ہو یا نہ ہو۔ باپ کیسا ہی ظالم ہو۔ دولت میں قرض کا کیڑا لگ گیا ہو۔ لیکن شادی کے بازار میں تو خرید و فروخت اور مانگ کا حساب ہے۔ بروں کی تعداد کم ہے لیکن بروں کے خریدار بہت ہیں۔ اس لئے جب تک بر کے سرپرست کو خواہش کے مطابق دام نہ مل جائیں۔ لڑکی کی شادی کس طرح ہو؟

(۲)

پہلے سبھدرا کو دیکھتے ہی رادھا کانت کھل اُٹھتے تھے۔ لیکن اب اُسے دیکھتے ہی اندر سے ایک آہ نکل پڑتی ہے جس سبھدرا کو پھول کی طرح اپنی آغوش میں لے کر کھلاتے تھے۔ وہی آج چھاتی پر پتھر کے مانند معلوم ہوتی ہے۔ بابو رادھا کانت سبھدرا کے سامنے خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس زبردستی کی خوشی میں رنج اور زیادہ جھلکنے لگتا ہے۔ پہلے گلاب کے پھول سے آنکھیں نہیں ہٹتی تھیں۔ اب تو کانٹے ہی کانٹے چبھتے ہیں۔ رادھا کانت آج تک جسے آنکھوں کی پتلی سمجھتے تھے اب اسے دیکھتے ہی آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ جس سبھدرا کی شیریں زبانی سُن سُن کر پھولے نہیں سماتے تھے آج اُس کی خاموشی بھی دل میں جلن پیدا کرتی ہے۔ جس کو ہمیشہ محبت سے چھاتی سے لگاتے تھے آج اسے انتہائی رُکھائی سے جواب دیتے ہیں۔

منجھلے لڑکے ہری کانت نے کہا۔ "بابوجی۔ خبر ملی ہے کہ کسم پور والے دوسری جگہ بات کر رہے ہیں۔"

رادھا کانت نے غمگین ہو کر کہا۔ "اچھا ہی ہے۔ وہاں نسبت کرنا میں خود ناپسند کرتا تھا۔"

ہری کانت باپ کی غمگینی دیکھ کر بولے۔ "کہیئے تو ایک بار پھر وہاں جاؤں۔"

رادھا کانت جھنجلا کر بول اُٹھے۔ "بار بار دوڑنے سے کیا ہوگا؟ دوسرا کوئی بہت رقم دیتا ہے۔ مجھ میں اتنی بڑی حیثیت نہیں ہے۔"

ہری کانت خاموش ہو کر چلے گئے۔

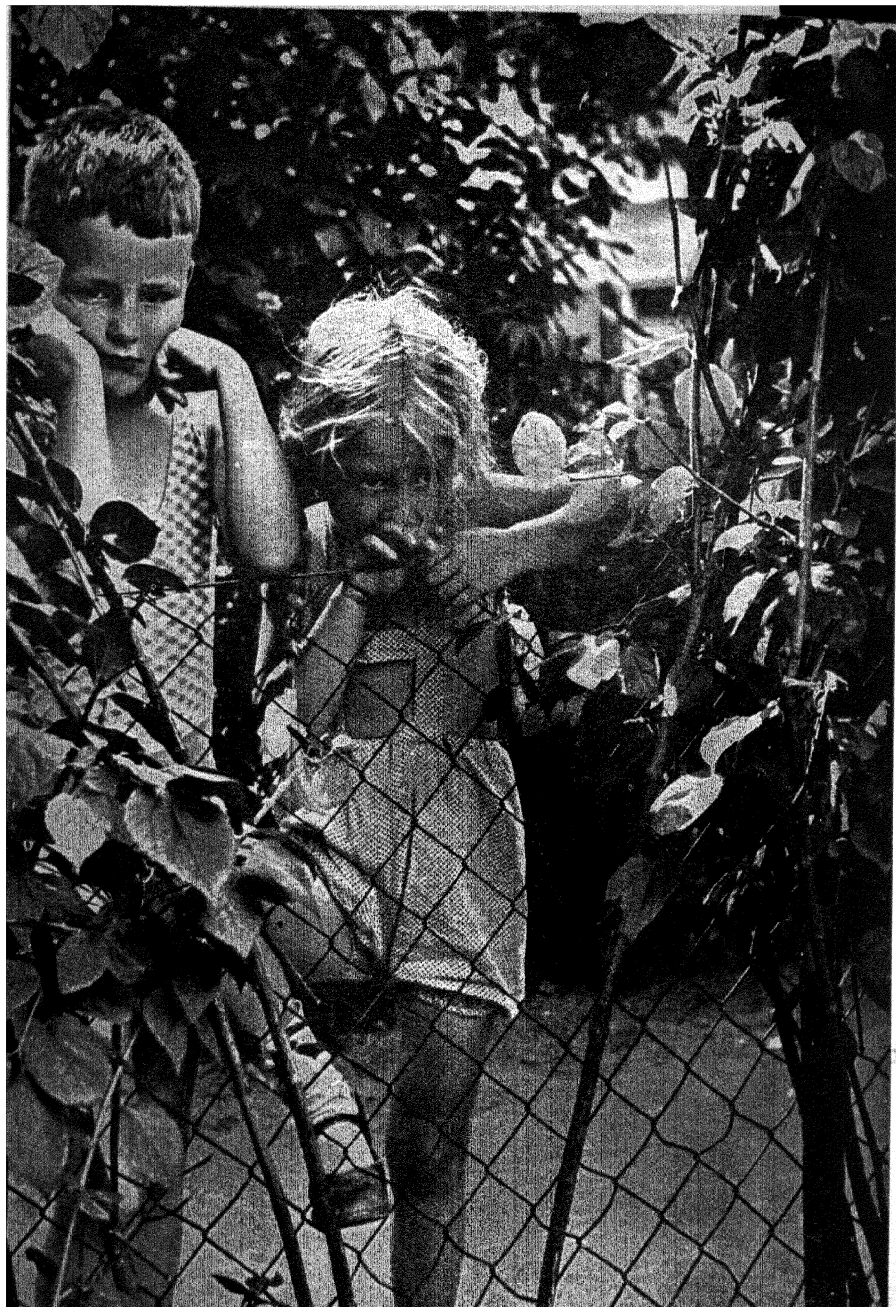
اسی وقت سبھدرا نے آ کر کہا۔ "ناشتہ لے آؤں بابوجی۔"

"نہیں میں ناشتہ نہیں کروں گا۔"

سبھدرا نے پیار کے ساتھ کہا۔ "بڑی بھابی نے آم کا مربہ بنایا ہے بابوجی۔"

رادھا کانت کا سوکھا چہرہ کچھ لال ہو گیا۔ وہ بولے۔ "میں نے ایک بار کہہ دیا۔ ناشتہ نہیں کروں گا۔"

سبھدرا کچھ دیر سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ واپس آ گئی۔



کھلے بال







هانی گرتب

رادھاکانت سوچنے لگے ۔ "میرا مزاج کیسا ہوگیا ہے ۔ لڑکی کا اس میں کیا قصور ؛ بلاوجہ میں اسے جلایا کرتا ہوں"۔ کبھی کبھی اکیلے میں کہتے ـــ "ایشور ! یہ تو نے کیا کیا ! ایک تو سارے حوصلے خاک میں مل گئے ۔ جان سے عزیز ایک مُورت بنائی ۔ اُسے اب مجبور ہو کر ندی میں بہانا پڑ رہا ہے ۔ نہ جانے کس گھاٹ لگے گی ۔ لیکن کیا مجھ میں انسانیت بھی نہ رہے گی ۔ میرا مزاج کیسا ہوتا جاتا ہے ایشور ۔ اب تیرا ہی بھروسا ہے۔"

(۳)

سبھدرا اپنے باپ کے دل کو پہچانتی ہے ۔ اُسے اپنی تقدیر کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی باپ کی حالت کی ۔ پہلے وہ اپنے باپ کے دل کے ساتھ بے پروائی سے کھیلتی تھی ۔ لیکن اب وہ دن رات اِس فکر میں رہتی ہے کہ کہیں ان کے دل میں ٹھیس نہ لگ جائے ۔ دل کے سارے تار جھنجھنانہ اُٹھیں کوئی تار ٹوٹ نہ جائے ۔ اسی لئے پہلے جہاں وہ مست ہرنی سی چھلانگیں بھرا کرتی تھی، وہاں اب سہم سہم کر پیر رکھتی ہے ۔ جہاں آزاد پرند کے مانند چہچہایا کرتی تھی وہاں اب تول تول کر منہ سے آواز نکالتی ہے ۔

سبھدرا اب وہ سبھدرا نہ رہی ۔ جس کا زیادہ وقت بھابیوں سے ہنسی مذاق کرنے میں گزرتا تھا ۔ سبھدرا کی شوخی سے تنگ آ کر چھوٹی بھابی کہتی تھیں ـــ "بی بی ۔ اب تم بڑی ہوئیں جھک کر چلا کرو ۔ آنچل سر پر رکھا کرو ۔ اب بچی نہیں ہو ۔ یہ سُن کر سبھدرا کھِل کھِلا کر ہنس پڑتی اور بھابی کے گلے سے لپٹ کر کہتی ـــ "میں بچی تو ہوں ہی ، تمہاری طرح میں بڑی کبھی نہ ہوں گی" لیکن اب تو سبھدرا کو شباب کا احساس بھی بار معلوم ہوتا ہے ۔ اب وہ جسم کو اتنا دبا کر چلتی ہے کہ بھابیوں کو بھی پہچاننے میں دھوکا ہوجاتا ہے ۔

جس دن بڑے بھائی نااُمید ہوکر آئے سبھدرا کا کلیجہ پھٹ گیا ۔ رات بھر اسے نیند نہیں آئی ۔ وہ پلنگ پر پڑی پڑی سوچتی رہی ۔ کیا بابوجی کی پریشانی کسی طرح دور نہیں کی جاسکتی ؛ اس کے دل میں کتنے ہی خیال آئے اور آکر چلے گئے ۔ وہ سوچنے لگی "سارا خاندان میرے لئے بر ڈھونڈنے میں پریشان ہے ۔ بابوجی کی حالت کیسی ہوگئی ہے ؛ کیسی بُری قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی ؛ پیدا ہوتے ہی ماں کو کھایا ۔ اب نہ جانے اس گھر پر کیا کیا مصیبت آنے والی ہے ۔ آہ میں سراپا مصیبت ہوں، کاش میں آج کسی طرح مرجاتی ! یہ سب مصیبت ختم ہوجاتی"۔ اس کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے ۔ وہ پھر سوچنے لگی "بابوجی کو اتنی پریشانی کیوں ہے ؛ کیا میرے لئے بر اس دُنیا میں ہے ہی نہیں ؛ معمولی گھر تو بہت ملیں گے ۔ مگر بابوجی مجھے کسی امیر گھر میں دینا چاہتے ہیں ۔ لیکن جو جتنا امیر ہے اُتنی ہی اُسے زیادہ ہوس ہے ۔ بھلا پتاجی اتنی دولت کہاں سے لائیں ؛ میرے چار بھائی ہیں ۔ ان کے بھی بال بچے ہیں ۔ لڑکیوں کا شادی بیاہ کرنا ہے ۔ کاش میں بابوجی سے کہلا سکتی کہ مجھے معمولی گھر میں بیاہ دیں امیر گھر میں نہیں جانا چاہتی ۔ باپ بھائی کا خون سکھا کر امیر گھر میں کیا سُکھ مِل جائے گا ؛"

دوسرے دن سبھدرا کو دیکھ کر چھوٹی بھابی نے پوچھا ـــ "تمہاری آنکھیں کیوں لال ہوگئی ہیں ؛"

"رات کو نیند نہیں آئی بھابی"

بھابی نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی سے نیند کمبخت بھاگ کھڑی ہوئی"۔

سبھدرا نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "مذاق نہ کرو بھابی۔ آج تم سے ایک بات کہنی ہے"۔

بھابی نے سبھدرا کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔ "تم نے منہ تو ایسا بنایا ہے جیسے ابھی سے خانہ داری کی فکر آپڑی ہو۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو"۔

سبھدرا بھابی کے ہاتھ سے ٹھوڑی چھڑا کر بولی۔ "بابو جی سے کہلا دو میں امیر گھر میں جانا نہیں چاہتی۔ معمولی گھر میں بیاہ دیں۔ ان کی دعا سے میں وہیں سکھی رہوں گی"۔

بھابی نے سبھدرا کی پیٹھ پر تھپکی لگا کر کہا۔ "اپنی شادی کا انتظام بھی خود ہی کرو گی۔ تم تو یکا یک بزرگ ہو اُٹھیں"۔

اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چل دیں۔ سبھدرا نے پکارا "ذرا سُن تو لو بھابی"۔ بھابی نے جاتے جاتے کہا۔ "ہٹ پگلی کہیں کی"۔

لیکن یہ بات چھوٹی بھابی سے بڑی بھابی اور بڑی بھابی سے بڑے بھائی لچھمی کانت کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ایک دن جب باپ بیٹوں میں شادی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ لچھمی کانت جی نے سبھدرا کی باتیں رادھا کانت جی کے کانوں میں ڈال دیں۔ وہ غمگین ہو کر بولے۔ "لچھمی! سبھدرا اب بچی نہیں ہے وہ سب سمجھنے لگی ہے، جب وہ میری پریشانی دُور کرنے کو اتنی فکر مند ہے۔ تو کیا میرا کچھ فرض نہیں؛ پھر اپنی حیثیت کا بھی خیال کرنا پڑے گا۔ بھائی! آج تک جیسے گھروں میں ہمارے خاندان کی لڑکیاں گئی ہیں سبھدرا بھی ویسے ہی گھر میں جائے گی، اس کے لئے چاہے جتنی مصیبت اُٹھانا پڑے"۔

(۴)

بیساکھ کا مہینہ آگیا۔ جیٹھ کے بعد پھر شادی کی ساعت نہیں ہے۔ لیکن ابھی تک سبھدرا کی نسبت نہیں ٹھہری۔ کہیں ٹھہرے گی بھی یا نہیں، کوئی کہہ نہیں سکتا۔ نائی برہمن کی کون کہے۔ چاروں بھائیوں نے کونا کونا ڈھونڈ ڈالا۔ لیکن جیسے خدا نے سبھدرا کا جوڑا بنایا ہی نہیں۔

ایک تو ضعیفی دوسرے یہ دن رات کی فکر۔ بیچارے رادھا کانت کی تندرستی اک دم گر گئی۔ آج چھ مہینے سے وہ پلنگ پر پڑے ہیں۔ علاج معالجہ میں کوئی کسر نہیں ہے۔ لیکن اچھے کیسے ہوں؛ ان کی دوا تو کچھ اور ہی ہے۔ سب جانتے ہیں بیٹی کی فکر اُن کی دشمن ہو رہی ہے۔ لیکن جو بات ہاتھ میں نہیں اس میں کیا چارہ؛

پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی رادھا کانت شادی کے متعلق پوچھا کرتے ہیں۔ پر اُمید کی جھلک نظر نہیں آتی۔ لوگ مایوس ہو کر واپس لوٹ رہے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی رادھا کانت سے چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا تقاضا اتنا بڑھ جاتا ہے کہ آخر میں سچا حال بتانا ہی پڑتا ہے۔ تسکین اور اُمید دلائی جاتی ہے لیکن مریض کے چہرے کی اُداسی دُور نہیں ہوتی۔ جس کے دِل میں فکر کا

کیڑا لگ گیا ہو اسے دوا کیا فائدہ دے سکتی ہے۔ زندگی سے بالکل مایوس ہو کر رادھا کانت نے کہا۔" لچھمی! کیا میں سبھدرا کا بیاہ نہ دیکھ سکوں گا؟ اب میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ جیسے ہو مجھے بیٹی کا بیاہ دکھا دو۔"

لچھمی کانت نے بغیر کچھ جواب دیئے ایک بار بھیگی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ اور کمرے سے باہر آ گئے۔ اسی وقت کپڑے پہن کر کہیں چلے گئے۔

ایک ہفتہ بعد وہ واپس آئے۔ تب بھی ان کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت نہ تھی۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی رادھا کانت نے پوچھا۔" کیوں لچھمی کیا حال ہے؟"

لچھمی کانت نے کہا۔" بابوجی! میں ایک گھر دیکھ آیا ہوں۔ ایک طرح سے بات بھی پکی ہو چکی ہے۔ آپ کو پسند ہو تو تلک بھیجنے کا بھی انتظام کر دوں۔"

"تم کو پسند ہے؟"

"بابوجی! اور کوئی گھر بھی تو نہیں نظر آتا۔"

"تو بھائی، میں اپنی پسند کی کیا کہوں؛ میرا تو دل ٹوٹ گیا۔ سارا حوصلہ پست ہو گیا۔ اب میں کیا پسند کروں اور کیا ناپسند کروں؟"

"لڑکا تو اچھا ہے۔ البتہ اتنا پڑھا ہوا نہیں ہے۔ مالی حالت اچھی ہے۔"

رادھا کانت نے ذرا بے صبری سے پوچھا۔" روپیہ تو بہت مانگا ہوگا؟"

"بہت زیادہ تو نہیں مانگا۔ بات یہ ہے کہ لڑکے کے باپ کا مزاج ذرا سخت واقع ہوا ہے اسی لئے لڑکا اب تک کنوارا تھا۔ لڑکے کی عمر زیادہ ہو جانے سے اب انہیں بھی فکر لگی ہے۔"

رادھا کانت کا چہرہ اُتر گیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور پوچھا" آخر بات کتنے پر طے ہوئی؟"

"پانچ ہزار پر۔"

رادھا کانت نے لمبی سانس لی۔ لچھمی کانت نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا" بابوجی! میں شرت نوشی تو کر آیا ہوں۔ آپ کا حکم ہو تو تلک کی رسم بھی کرا دوں۔ کیونکہ اب دن بھی بہت کم رہ گئے ہیں۔"

رادھا کانت نے کروٹ بدل لی اور بہت دھیمی آواز میں کہا" بھئی مجھ سے کیا پوچھتے ہو؛ تم لوگ اب سمجھ دار ہو گئے۔ جو مناسب سمجھو کرو۔ میں تو اب چند دن کا مہمان ہوں۔"

"آپ کو بالکل ناپسند ہو بابوجی تو اور گھر دیکھا جائے۔"

"اب پسند اور ناپسند کیا؛ سبھدرا کا بیاہ تو کرنا ہی ہوگا۔ اس کی تقدیر میں جیسا لکھا ہے وہی ہوگا۔ ہمارے تمہارے سر

پٹکنے سے کیا ہوتا ہے"۔

اس معاملہ میں ہامی بھرتے ہوئے رادھا کانت کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن جب انسان کی تمنائیں پوری نہیں ہوتیں، تو قسمت کا پھیر سمجھ کر دل کو تسلین دینی ہی پڑتی ہے۔

(۵)

آج رات سبھدرا کی شادی ہے، چاروں طرف چہل پہل ہے۔ جلدی جلدی سب انتظام ہو رہا ہے۔ سب لوگ کام میں مصروف ہیں، بارات کے استقبال کا انتظام ہو رہا ہے۔ چند آدمی ضروری سامان جنواسے میں بھیج رہے ہیں۔ نوبت خانہ میں نوبت بج رہی ہے۔ کام میں پریشان ہونے پر بھی لوگ آتے جاتے ٹھٹک کر شہنائی کی سریلی تان سُن لیتے ہیں۔

شام کے وقت بڑی دھوم دھام سے بارات آئی۔ بارات دیکھنے کو لوگ دوڑ پڑے۔ دیکھ کر جو واپس ہوتا وہی مُونہ سے تعریف کرتا۔ اندر محل میں نہ جانے کتنے ڈھنگ سے خبر پہنچنے لگی۔ رادھا کانت بھی پلنگ پر پڑے ہوئے بارات کی تعریف سننے لگے۔

دولہا دیکھنے کو سب ہی بے چین تھے۔ محل کی عورتیں بھی دولہا کی باتیں سننے کو بے چین ہو رہی تھیں۔ سبھدرا کی بھابیاں کام میں مصروف ہونے پر بھی بیچ بیچ میں پوچھ رہی تھیں کہ دُولہا کیسا ہے؟

قریب ایک پہر رات بیتے بارات بڑی شان سے دروازے لگی۔ لچھمی کانت کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایک بڑے شامیانے میں باراتیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوا تھا۔ شامیانے کی سجاوٹ دیکھنے کے لائق تھی۔

لچھمی کانت نے سمدھی کے پاس جا کر بہت عزت کے ساتھ اپنے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمانے کی التجا کی لیکن سمدھی صاحب نے نہ کوئی جواب دیا اور نہ سواری پر سے اُترے۔ دیر ہوتی دیکھ کر لچھمی کانت نے گھبرا کر کہا" ساعت بیتی جا رہی ہے۔ نیک کام وقت پر ہی ہونا چاہئے"۔ یہ سن کر سمدھی صاحب کے ابرُو پر بل پڑ گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں میں ایک کو اشارہ کیا۔ وہ لچھمی کانت کے پاس جا کر بولا" بارات دروازے لگ گئی۔ اب ہم دولہا سمیت جنواسے جاتے ہیں۔ وہاں سے آپ پھر دولہا کو لے آئیں اور شادی کی رسم ادا کریں۔ ہمارے یہاں کا یہی رواج ہے"۔

لچھمی کانت کے لئے یہ بالکل نیا رواج تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں پڑ گئے۔ اُنھوں نے کہا" مگر ساعت جو بیتی جا رہی ہے"۔

اس آدمی نے ہنس کر جواب دیا" ایسے کاموں میں دیر ہو ہی جاتی ہے آپ کہاں تک جلدی کر سکتے ہیں بابو صاحب"۔

لچھمی کانت دوڑتے ہوئے باپ کے پاس گئے۔ رادھا کانت نے ایک لمبی سانس لے کر کہا" بھیا جو وہ کہتے ہیں وہی کرو"۔

ادھر سمدھی صاحب نے پہلے ہی کوچ کر دیا تھا جب تک لچھمی کانت واپس آئیں دولہا کی سواری بھی بڑے پھاٹک سے باہر ہو چکی تھی۔

اس نئے چلن نے عورتوں کے حلقے میں کھلبلی پیدا کر دی۔ شادی کی سب تیاری ہو چکی تھی۔ سبھدرا بھی اوڑھنی سے

ڈھک کر بٹھا دی گئی تھی۔ منڈپ میں صرف دُولہا کے آنے کی کمی تھی۔ لیکن یہ کیا ہوگیا!
محل میں اتنا تقاضا ہوا کہ لچھمی کانت کو فوراً ایک موٹر میں بیٹھ جنواسے جانا پڑا۔ ادھر سب بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگے۔
ایک گھنٹہ گزر گیا۔ گھبراہٹ پھیل گئی۔ سب کی زبان پر یہی سوال تھا "اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے!" جو آدمی خبر لانے جاتا۔ آکر ٹھیک حال نہ بتا سکتا۔ اتنے میں لچھمی کانت آئے اور سیدھے رادھا کانت جی کے پاس گئے۔ لوگوں کی بے چینی بڑھنے لگی۔ عجیب عجیب افواہیں اُڑنے لگیں۔

لچھمی کانت نے باپ کے پاس آکر اپنے بھائیوں کو بلایا۔ اور کئی بڑے بزرگوں کو ساتھ لے پھر جنواسے کو روانہ ہوئے۔
جنواسے سے واپس آئے لیکن دولہا اُن کے ساتھ نہ تھا۔ لوگوں کی پریشانی دُگنی چوگنی بڑھ گئی۔ ان لوگوں کے پہنچتے ہی رادھا کانت جی نے آہستہ سے پوچھا "کیا ہوا!"

لچھمی کانت نے مایوسی سے کمزور آواز میں کہا "بابوجی۔ وہ ضد کئے بیٹھے ہیں۔ بغیر پانچ ہزار اور لئے وہ کسی طرح شادی نہیں کرینگے۔"
"آخر اس کی کوئی وجہ بھی بتاتے ہیں!"
"وجہ کیا! انہیں روپیہ کی بھوک ہے۔ کچھ یوں ہی بے سر پیر کی بات کہتے ہیں۔ ذرا خبطی مزاج کے ہیں۔"
بڑے بھائی نے ابھی اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ منجھلے بھائی ہری کانت جھلا کر کہہ اُٹھے "وجہ کیوں نہیں بتاتے؟ وہ تو صاف ہی کہتے ہیں کہ تم نیچ خاندان کے ہو۔ تمہارے خاندان میں داغ لگا ہے۔ یہ مجھے پہلے معلوم نہ تھا۔ بھائی صاحب کی وجہ سے میں خاموش رہا ورنہ بتا دیتا۔"
لچھمی کانت نے بھائی کو خاموش کرتے ہوئے کہا "بھائی! نرمی سے کام لو۔ غصہ کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔"
رادھا کانت کے منہ سے ایک آہ نکل پڑی۔ وہ آپ ہی بول اُٹھے "میں نہیں جانتا تھا کہ بیٹی سبھدرا کے لئے مجھے یہاں تک برداشت کرنا پڑے گا۔"
لچھمی کانت نے باپ سے کہا "بابوجی آپ کہیں تو روپیہ کا بندوبست کیا جائے۔ بیاہ تو کسی نہ کسی طرح کرنا ہی ہوگا۔"
رادھا کانت جی کی آنکھوں سے دو بوند آنسو ٹپک پڑے۔ انہوں نے مُنہ پھیر کر کہا "وہ چلے جائیں میں ان سے شادی نہیں کروں گا۔"
لچھمی کانت نے گھبرا کر کہا "یہ کیا بابوجی! سبھدرا چوکے پر بیٹھ چکی ہے!"
"کوئی ہرج نہیں۔ وہ بارات کے ساتھ واپس جائیں۔"
"بابوجی ایک بار سوچئے تو دُنیا کیا کہے گی!"
رادھا کانت نے مڑ کر لچھمی کانت کو دیکھا اور استقلال سے کہا "میں کیا بغیر سوچے کہہ رہا ہوں۔ میری آنکھوں پر سے تاریک

پردہ ہٹ گیا۔ میرا کہا مانو اُن سے واپس جانے کو کہہ دو۔"

لچھمی کانت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا بابو جی"۔

رادھا کانت جی کی آواز میں اتنی طاقت نہ جانے کہاں سے آگئی وہ بولے "گھبراؤ مت۔ ابھی کسی کو بھیج کر ہیڈ ماسٹر کو بلوالو"۔

ہیڈ ماسٹر گوپی بلبھ آگئے۔ رادھا کانت نے سلام کا جواب دے کر کہا "ہیڈ ماسٹر صاحب بہت دن ہوئے میں نے آپ کے اسکول میں ایک گورا اور اکہرے بدن کا لڑکا دیکھا تھا، اس کا کیا نام ہے؟"

گوپی بلبھ یاد کرکے بولے "جس کے لئے میں نے آپ سے مدد مانگی تھی؟"

"ٹھیک! جسے آپ بہت غریب بتاتے تھے"۔

"اس کا نام ہری شنکر ہے۔ وہ تو میرے پاس ہی رہتا ہے"۔

"آپ اسے بلوائیے۔ میں اپنی لڑکی اس کو دان دوں گا"۔ سننے والے حیرت سے منہ دیکھنے لگے۔ گوپی بلبھ گھبرا کر بولے "وہ تو بہت ہی غریب ہے بابو صاحب۔ یوں لڑکا تو وہ بہت اچھا ہے"۔

رادھا کانت نے جوش سے کہا "امیر اور غریب کا بھید آج میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ گوپی بابو۔ افسوس ہے کہ پہلے معلوم نہ ہوا ورنہ میرے بچوں کو در در کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں"۔

بات کی بات میں گوپی بلبھ نے ہری شنکر کو رادھا کانت جی کے سامنے لاکھڑا کیا۔ لڑکے کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انہوں نے ہری شنکر کو پاس بلا کر محبت سے کہا "بیٹا گوپی جیسا کہیں ویسا کرو۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے"۔

ہری شنکر بھونچکا سا رہ گیا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ گوپی بلبھ نے اسے لے جا کر کپڑے بدلوائے اور وہ لگن گزرنے کے پہلے ہی منڈپ میں پہنچ گیا۔ رسوم ادا کرتے ہوئے وہ حیرت سے دیکھتا تھا اور برہمن کا کہنا کرتا جاتا تھا۔ اتنی جلدی میں یہ سب ہو گیا کہ گھر اور باہر کے سب لوگ اچنبھے میں رہ گئے۔ اس کو دُکھ جانے یا سُکھ یہ کوئی ٹھیک نہ سمجھ سکا۔

بیاہ ختم ہونے پر گوپی بلبھ نے ہنس کر ہری شنکر سے کہا "تو اپنی قسمت سراہ ہری۔ آج تو رنک سے راجا ہو گیا۔ اس پر سبھدرا جیسی استری رتن ملی۔ بول مجھے گرو دکشنا میں کیا دے گا؟"

ہری شنکر جیسے ان کی بات نہ سمجھ سکا ہو اس طرح ان کا مُنہ دیکھنے لگا۔

اُدھر سبھدرا چھوٹی بھابی کے گلے سے لپٹ کر خوب رو ئی طبیعت کے کچھ سکون پذیر ہونے پر اس نے کہا "آج مجھ کو مُنہ مانگی مراد مل گئی بھابی! اب دعا دو کہ سکھ کے ساتھ اپنا جیون گزار سکوں اور کبھی چاروں بھائیوں کے لئے بار نہ ہوں۔ آج پھانسی پر لٹکتے لٹکتے میری رہائی ہو گئی بھابی!" × × × × × × × × ×

ہیم لتا اشٹھانہ

(ہندی سے ترجمہ)

انتہائے کرم

سمندروں کو مِلے تجھ سے گوہر و مرجاں
بھرا ہُوا ہے گلوں سے بہار کا داماں
جواہرات سے بھرپور کوہسار کئے
شمیم و رنگ سے لبریز لالہ زار کئے
فلک کو انجم و خورشید و ماہتاب مِلے
چمن کو یاسمن و لالہ و گلاب مِلے
سحر کو نُورِ تبسّم کی تازگی بخشی
شفق کو خوابِ محبّت کی بیخودی بخشی
مرا نصیب مگر سب سے بڑھ گیا اے دوست!
ترے کرم کی ہوئی مجھ پہ انتہا اے دوست!
عجیب دولتِ نایاب مِل گئی مجھ کو
عطا ہوئی ہے محبّت کی بیکلی مجھ کو

اثر صہبائی

رشحات

رُباعی

روناچاہیں اگر تو روتے نہ بنے
سوناچاہیں اگر تو سوتے نہ بنے
اس جانِ وبالِ جاں کو شامِ فرقت
کھوناچاہیں اگر تو کھوتے نہ بنے

یہ بیخودی نہیں ہے یہ ہے انتہائے ہوش
خورشید ہی کی آخری منزل تو رات ہے
گردوں شرارِ برقِ دلِ بے قرار دیکھ
جن سے یہ تیری تاروں بھری رات ہے
چمکا ہؤا جمال ترا۔ دِل دُکھا ہؤا
دونوں میں کون مایۂ نازِ حیات ہے
ہستی کو جس نے زلزلہ ساماں بنا دیا
وہ دل قرار پائے مقدر کی بات ہے

نہ رہی وہ بزم نہ اب وہ جلوۂ جامِ مردفگن رہا
نہ رہے وہ مست نہ کوئی اہلِ نگاہ توبہ شکن رہا
نہ وہ چشمِ لطف وکرم رہی نہ وہ دوستی کا چلن رہا
رہیں حسن کی وہی شوخیاں وہی دورِ چرخِ کہن رہا

فراق گورکھپوری

رادھا کے گیت

(۱)

سکھی، آج رادھا کے ساتھ جمنا بھی تو رہی ہے!!

جمنا کے یہی سہاونے کنارے تھے،

جہاں میں نے اپنی جوانی کا پہلا نادان گیت گایا تھا

جمنا کے یہی جل بھرے کنارے تھے،

جہاں میں نے اپنے جیون کو پھولوں کے ہاتھوں میں سونپا تھا،

سکھی، آج رادھا کے ساتھ جمنا بھی تو رہی ہے!!

(۲)

سکھی، رادھا ہنستے ہنستے مر جائے گی!!

بسنت گا رہی ہے اور رو رہی ہے،

کوئل ناچ رہی ہے اور تڑپ رہی ہے،

سکھی، رادھا ہنستے ہنستے مر جائے گی!!

(۳)

آکاس پر تارے اسی طرح چمکتے رہیں گے!

باغوں میں پھول اسی طرح کھلتے رہیں گے!

کلیوں پر بھونرے اسی طرح ناچتے رہیں گے!

مگر ایک دن رادھا اپنے جیون سے یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے روٹھ جائیگی

"میں اپنی موت کے پاس صرف اسی آس میں جا رہی ہوں

کہ وہاں میرا پریم ہوگا!!

(۴)

پھولوں نے آہ بھری،

کلی ڈر گئی!

چاند رویا،

تارے ڈر گئے!

سکھی، رادھا کے من میں اتنا بل کہاں کہ پریم کی آہوں کو چھپا لے اور نہ ڈرے!!

(۵)

سکھی، ابھی کلی کا پریم سپنوں میں کھیل رہا ہے!!

پھول ہنسے!

کلی نے جانا "شاید ہنسی ہے پریم —— پھولوں کی!!

پھول ناچے!

کلی نے جانا "شاید ناچ ہے پریم —— پھولوں کا!!

پھول گائے!

کلی نے جانا "شاید گیت ہے پریم —— پھولوں کا!!

سکھی، ابھی کلی کا پریم سپنوں میں کھیل رہا ہے!!

عظیم قریشی

معارف

(۱)

کلیمِ طورِ ہستی ہیں ہمکلامِ روحِ ہستی ہے
ازل سے مسلکِ اہلِ نظر آتش پرستی ہے
مری حیرت سے یہ آکر ازل سے بے پیمانہ ہوا گویا
بلندی کا اور جب سمجھا تری ہمت کی پستی ہے

(۲)

مری ناکامیاں سنگِ فسانِ تیغِ ہمت ہیں
مری ناشادیاں روح بخشِ جانِ بلاغت ہیں
غم و اندوہ میرے پیش خیمہ ہیں مسرت کا
مرے حق میں فنا کی بجلیاں بارانِ رحمت ہیں

(۳)

کرو جو ہائے جفائے ناز کا شکوہ ہو تو کیوں ہو مجھ کو
خدنگِ ناز کا شکوہ ہو تو کیوں ہو مجھ کو
معاذ اللہ نہیں سمجھی مطرب کی
شکستِ ساز میں مضمر ہے حکمت
سراپا درد کی آواز کا شکوہ ہو تو کیوں ہو مجھ کو

(۴)

فرو ہو جائے ستانا میری دیوانگی مجھ کو
کہ ... پیدا ہو گئی بیتابی مجھ کو
کلیجہ ... تشنہ بیتابی
ہمیں تھی یہی حال اور اس پر بلا کا شوق بیتابی
سینہ آئے نہ کیوں ... مرادوں کی بیتابی مجھ کو

امینِ حزیں

ناپُختہ چُوزے

(ڈراما)

منظر:۔

ایک گرمائی نزہت گاہ ۔ آدھی رات گزر چکی ہے ۔ ایک نوعمر لڑکا ایک عالی شان مکان کی نچلی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی نہایت آہستہ آہستہ کھٹکھٹاتا ہے ۔ کوئی جواب نہیں ملتا ۔ وہ پھر کھٹکھٹاتا ہے ۔

ایک آواز۔ کون ہے؟

نوعمر لڑکا۔ جیولز۔

آواز۔ کون سا جیولز؟

لڑکا۔ جیولز ہوٹکو۔ کھڑکی کھولو الفرڈ۔

[کھڑکی کھلتی ہے ۔ رات کے لباس میں ایک نوخیز لڑکا دکھائی دیتا ہے ۔ دونوں میں سے ایک کی عمر بھی سولہ سال سے زیادہ نہیں]

الفرڈ۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟

جیولز۔ مجھے گھر سے جواب مل گیا ہے۔

الفرڈ۔ کیا؟ گھر سے نکال دیئے گئے ہو؟

جیولز۔ خدا کے لئے مجھے اندر آنے دو ورنہ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گا۔

[الفرڈ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیتا ہے اور وہ اُچک کر کمرے میں داخل ہو جاتا ہے]

الفرڈ۔ کھڑکا کیوں کرتے ہو۔ اگر ابا کو خبر ہو گئی کہ تم اس طرح اندر داخل ہوئے ہو تو وہ مجھے ذبح کر ڈالیں گے۔

(دونوں اندھیرے میں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہتے ہیں)

الفرڈ۔ تم گھر سے کیوں نکالے گئے ہو۔ کس نے تمہیں نکالا ہے؟

جیولز۔ ابا نے۔

الفرڈ۔ کیوں؟

جیولز۔ (ذرا فخریہ انداز میں) سچ پوچھو تو معاملے کی تہ میں ایک عورت ہے۔
الفرڈ۔ (متاثر ہو کر) اچھا؟

(ہکا بکا ہو کر نظریں اس کے چہرے پر جما دیتا ہے جولز کھسک کر اور قریب آ جاتا ہے)

جیولز۔ تم ہیڈوگ بارنا کو جانتے ہو؟
الفرڈ۔ ہاں۔ اب وہ بیگم سٹرٹینر ہے۔
جیولز۔ اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں اس پر مرتا ہوں؟
الفرڈ۔ نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہ تھا۔
جیولز۔ خیر اب تو تمہیں معلوم ہو گیا۔
الفرڈ۔ ہاں اب معلوم ہو گیا۔
جیولز۔ ہمارے گھر میں برسوں اس کا آنا جانا رہا ہے۔ وہ میری آپا کی سہیلی ہے چونکہ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑی ہے اس لئے اس نے میری طرف کبھی توجہ نہ کی تھی۔ وہ مجھے ایک ننھا بچہ سمجھتی تھی۔ میں کسی طرح اس کی نظر چڑھتا ہی نہ تھا۔ اُن دنوں میں صرف تیرہ سال کا تھا۔ اب اس بات کو تین سال گزر چکے ہیں۔ اُس کا شوہر عمر میں اُس سے بہت بڑا ہے اور اُسے اپنے شوہر سے نفرت ہے۔
الفرڈ۔ تمہیں کس طرح معلوم ہے؟
جیولز۔ سنو میں بتاتا ہوں . . . . اچھا تو شادی ہو جانے پر بھی ہیڈوگ آپا کے پاس آتی جاتی رہی اور میں اُسے دل دے بیٹھا۔ جب تک وہ ایک کنواری لڑکی رہی مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی لیکن اُس کے ایک بیاہتا عورت ہو جانے کے بعد میں سودائیوں کی طرح اُسے چاہنے لگا۔ مگر یہ محبت یکطرفہ تھی۔ بھلا جب کوئی بے چارہ صرف سولہ سال کا ہو . . . . اور پھر ایک ایسی لڑکی . . . . آخر وہ کیا دیکھ کر مجھ پر فریفتہ ہوتی۔ آہ میری قسمت . . . . تم جانتے ہی نہیں الفرڈ اس طرح آدمی کا حال کیا ہوتا ہے بس جان پر ہی بن جاتی ہے۔ نہ کھانا پینا سوجھتا ہے نہ نیند ہی آتی ہے اور نہ امتحان کی تیاری ہو سکتی ہے . . . . آج کل تو مجھے ہیڈوگ کے سوا دُنیا کی سب چیزیں فضول معلوم ہوتی ہیں۔ میں ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہتا ہوں، اُس کی آواز سنتا رہتا ہوں اور جب تک وہ بیٹھی رہتی ہے اس کی خوشبو سونگھتا رہتا ہوں۔ رات کو اُسی کے خیالوں میں سوتا ہوں اور صبح اسی کے خیالوں میں بیدار ہوتا ہوں۔ بس میں کہیں کا نہیں رہا . . . .

[وقفہ]

الفرڈ۔ اچھا تو بتاؤ واقعہ کیا ہُوا؟

جیولز۔ کل وہ پھر آئی تھی لیکن مجھ پر اُس نے بھُول کر بھی نظر نہ ڈالی۔ وہ کسی طرح مجھے خاطر میں لاتی ہی نہیں۔ . . . میں یہ بھی تو نہیں کرسکتا کہ اُس کے رُوبرو جاکر صاف صاف کہہ دوں کہ مادام میں تمہارا عاشق زار ہوں۔ وہ یہ سُن کر ہنس دے گی یا زیادہ سے زیادہ میرے گال پر ایک چانٹا لگا دے گی۔ میری جان بڑی مشکل میں ہے۔ کچھ نہیں سوجھتا کیا کروں۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ گولی مار کر اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں۔ . . . کل جس وقت وہ آئی میں فوراً بھانپ گیا کہ وہ کسی وجہ سے کڑھ رہی ہے۔ آتے ہی وہ آپا کو ایک طرف لے گئی اور وہ دونوں آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگیں۔ پھر جب ماں ادھر گئیں تو وہ باہر باغ میں چلی گئیں۔ آخر شام کو دونوں اندر آئیں۔ ہیڈوگ بہت رات گئے تک ہمارے ہاں ٹھہری رہی۔ اس وقت اس نے تنہا بڈاپسٹ جانا مناسب نہ سمجھا اور ٹیلیفون کے ذریعہ سے اپنے شوہر کی اجازت لے کر ہمارے ہاں ٹھہر گئی۔ اس کے لئے بھی آپا ہی کے کمرے میں بستر بچھا دیا گیا۔

الفرڈ۔ اچھا تو پھر؟

جیولز۔ میرا کمرہ آپا کے کمرے کے ساتھ ہے۔

الفرڈ۔ ہاں ہاں پھر کیا ہُوا؟

جیولز۔ وہ دونوں جب سونے کے لئے گئیں تو میں بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک دروازہ ہے بس میں دم سادھے دبک بیٹھا اور لگا سُن گُن لینے۔

[کچھ توقف کرتا ہے]

الفرڈ۔ اب بولو گے بھی یا نہیں؟

جیولز۔ بات یہ تھی کہ وہ کہیں اپنے شوہر کے چھ سو کرونن خرچ کر بیٹھی تھی اور اگر وہ جلد یہ رقم پوری نہ کر دیتی تو اس کے شوہر کو خبر ہو جاتی۔ اب وہ دونوں کسی نہ کسی طرح روپیہ فراہم کرنے کے منصوبے سوچ رہی تھیں۔ رات بہت گزر چکی تھی لیکن اب تک وہ کسی فیصلہ پر نہ پہنچی تھیں۔ آخر بیچاری ہیڈوگ عاجز آ کر رونے لگی اور مجھے یوں معلوم ہُوا کہ میرے دل پر کوئی بھالے مار رہا ہے۔ اُس نے آپا کو بتایا کہ میں اتنی تنگ آچکی ہوں کہ آج صبح میں گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی لے لینے لگی تھی مگر کم بخت رسا ہی ٹوٹ گیا۔ اصل میں شادی کے بعد اس کا جسم گدرا گیا ہے اور وہ کچھ بھاری ہو گئی ہے۔ میں تم سے کیا کہوں آدمی اُس کے قریب سے گزرے تو عجیب ہی خوشبو آتی ہے۔ وہ بہت ہی اچھا عطر استعمال کرتی ہوگی۔ بس آدمی مست ہو جاتا ہے۔ اب اس کی باہیں بہت سڈول ہو گئی ہیں۔ ویسی دُبلی پتلی نہیں جیسی پہلے ہُوا کرتی تھیں۔ ہیڈوگ کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ کیا کروں مجھے اُس سے محبت ہی حد سے زیادہ ہے۔ الفرڈ! میرے اچھے الفرڈ! کاش تمہیں میری حالت کا اندازہ ہوتا ——

الفرڈ۔ چلاتے کیوں ہو؟

جیولز۔ کون چلاتا ہے؟

الفرڈ۔ اچھا کہو پھر کیا ہُوا؟

جیولز۔ چھ سو کرون کی رقم فراہم کرنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ میری آپا کے پاس اس سے بہت کم رقم تھی اور ہیڈوگ کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی اور وہ اپنے ماں باپ سے یہ رقم مانگتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔ آپا جو تجویز بھی اسے سمجھاتی وہ کہہ دیتی یہ ناممکن ہے۔ اُدھر یہ ضروری تھا کہ صبح تک رقم کہیں سے پیدا ہو جائے ورنہ اس کے شوہر پر راز فاش ہو جاتا۔

الفرڈ۔ راز فاش ہو جاتا تو پھر کیا تھا وہ اسے قید تھوڑا ہی کرا دیتا۔

جیولز۔ تم ابھی عقل کے کچے ہو۔

الفرڈ۔ کیوں؟

جیولز۔ تم یہ باتیں نہیں سمجھتے۔ دنیا ادھر کی اُدھر ہو جاتی مگر ہیڈوگ یہ کبھی گوارا نہ کرتی کہ یہ بات اس کے شوہر پر ظاہر ہو۔

الفرڈ۔ مگر اُس نے روپیہ کھویا کہاں؟

جیولز۔ یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔

الفرڈ۔ مجھے نہیں بتا سکتے؟

جیولز۔ نہیں۔

الفرڈ۔ لیکن تمہیں خود معلوم ہے؟

جیولز۔ ہاں میں جانتا ہوں کیونکہ وہ آپا کو بتا رہی تھی اور میں نے سنا تھا۔ ہاں اتنا میں تمہیں بتا دیتا ہوں کہ یہ روپیہ اُس نے کسی کو دے دیا تھا۔ لیکن اب اِس کے متعلق مجھ سے اور کچھ نہ پوچھنا۔ کیونکہ اگر تم میری زبان کو تپتے ہوئے سُرخ زنبور کے ساتھ پکڑ کر گُدی سے بھی کھینچ ڈالو گے تو اُس سے اور ایک لفظ تک بھی نہ نکل سکے گا۔

الفرڈ۔ بہت اچھا۔

جیولز۔ تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ دروازے کے پاس بیٹھے ہیڈوگ کی یہ باتیں سُن سُن کر مجھ پر کیا گزر رہی تھی میں سر سے لے کر پَیر تک کانپ رہا تھا۔ دروازے کے اُس طرف وہ سخت خطرے میں مبتلا پڑی تھی —— وہ عورت —— وہ تنہا عورت جو دُنیا بھر میں مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے ——

الفرڈ۔ اب پھر چلانے لگے ہو۔

جیولز۔ کون چلاتا ہے ؛

الفرڈ۔ اچھا کہو۔ پھر کیا ہوا ؛

جیولز۔ خیر وہ رو رہی تھی اور مارے غم کے اُس کا کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ اب مجھ سے کہاں تک صبر ہوتا۔ مَیں اُٹھا اور ابا کے پڑھنے لکھنے کے کمرے میں گیا۔ کنجی لے کر مَیں نے اُن کی میز کی دراز کھولی اور چھ سو کرونن گن کر نکالے۔ پھر پنجوں کے بل اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ہیڈ وگ کو بڈاپسٹ کی پہلی گاڑی پر سوار ہونے کے لئے صبح چھ بجے بیدار ہونا تھا۔ اور ساڑھے چھ بجے مَیں باغ میں اُس کا منتظر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی مَیں نے کہا "ہیڈ وگ یہ لو یہ چھ سو کرونن ہیں۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اب کسی قسم کی بحث نہ کرنا۔"

الفرڈ۔ اس نے کیا کہا ؛

جیولز۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔

الفرڈ۔ کس طرح ؛

جیولز۔ بہت حیران ہو کر۔ پھر اُس نے پوچھا یہ رقم کہاں سے آئی ہے۔ مَیں نے کہا اس کا کچھ خیال نہ کرو۔ بس تم لے لو۔ یہ رقم میں نے اپنے جیب خرچ میں سے بچا بچا کر جمع کی ہے۔ جب تم چاہو ادا کر دینا۔ وہ بانہیں میرے گلے میں ڈال کر خوشی سے رونے لگی۔ الفرڈ یقین کرنا کہ باغ کے تمام پھولوں کی مجموعی خوشبو بھی اتنی شیریں اور دلکش نہ تھی جتنی ہیڈ وگ کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے میری پیشانی کو چُوما اور پھر کہا "پیارے بچے! مَیں کس طرح تمہارے اس احسان کا شکریہ ادا کروں۔" مجھے اُس نے "پیارا" کہا تھا۔ خیر میں نے کہا تم پھر ایک دفعہ میرے مُنہ پر پیار کرو۔ وہ کچھ حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اور پھر اُس نے میرے مُنہ پر پیار کیا۔

[وقفہ]

الفرڈ۔ ہاں، ہاں، پھر؛

جیولز۔ پھر وہ پلٹی اور چلی گئی۔ بس "خدا حافظ" کہا۔ ۔ ۔ ۔ آہ کیسی اچھی بات تھی۔

الفرڈ۔ اچھا تو پھر تمہارے ابا نے روپیہ غائب پایا ؟

جیولز۔ ہاں۔ لیکن آج شام کے قریب۔ اُسی وقت اُنہوں نے تمام گھر کو خوفناک طور پر تلپٹ کرنا شروع کر دیا۔ ناچار مجھے بتانا ہی پڑا کہ یہ رقم میں نے چرائی ہے۔ اس پر شام کے چار بجے سے لے کر رات کے دس بجے تک انہوں نے مجھے اپنے مطالعہ کے کمرے میں بٹھائے رکھا تاکہ میں کسی طرح یہ بتا دوں کہ میں نے یہ رقم کیا کی ہے۔ مگر مجھے نہ بتانا تھا نہ میں

نے بتایا۔ دس بجے اُنہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ بارہ بجے تک میں سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں تو سر میں گولی مار کر اپنا بھیجا اُڑا دیتا لیکن میرے پاس پستول ہی نہ تھا۔ یہاں کوئی دریا بھی نہیں کہ آدمی ڈوب ہی مرے۔ اور گلے میں پھندا ڈال کر مرنا تو بہت ہی کریہہ اور خوفناک بات ہے۔ پھر میں تمہارے پاس چلا آیا۔

الفرڈ۔ تمہاری بہن نے کیا کہا ؛

جیولز۔ جب ابا نے مجھے گھر سے نکالا تو آپا نے مجھے بہت پیار کیا . . . . اور اب میری یہ حالت ہے کہ اگر تمہارے ابا کو معلوم ہو گیا کہ میں کھڑکی کے راستے سے اندر آیا ہوں تو وہ مجھے ذبح کر ڈالیں گے۔

الفرڈ۔ نہیں بلکہ وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔

جیولز۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے۔

[طویل خاموشی]

الفرڈ۔ پھر اب تمہارا کیا انجام ہوگا ؛

جیولز۔ خدا جانے !

الفرڈ۔ چلاتے کیوں ہو !

جیولز۔ کون چلاتا ہے !

[پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ جیولز اپنی قابلِ رحم حالت سے متاثر ہو کر پلنگ کے پایوں کے قریب فرش پر اوندھا گر جاتا ہے اور اپنی سسکیوں کی آواز کو دبا دینے کے لئے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیتا ہے۔ اس کے نمناک پپوٹوں پر آنسوؤں کے قطرے سوکھنے بھی نہیں پاتے کہ اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ لیکن الفرڈ کو نیند نہیں آتی۔ وہ پلنگ کے سرہانے کی طرف اکڑوں بیٹھا اپنی پوری کھلی ہوئی آنکھوں سے اپنے خوابیدہ دوست کو دیکھ رہا ہے اور بار بار اپنے ناتستی پزیر دل کو یہ کہہ کر اطمینان دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ صبح کسی نہ کسی طرح یہ ردّ و بدل رو براہ ہو ہی جائے گی۔]

مولنار

ترجمہ از حامد علی خاں

غزل

اگر بے پردہ بزم آرا رُخِ جانانہ ہو جائے
تو کعبہ دیکھتے ہی دیکھتے بُت خانہ ہو جائے

اُٹھالوں مَیں اگر ظرفِ وضو پیمانہ ہو جائے
اگر مسجد پہ ڈالوں اِک نظر مے خانہ ہو جائے

وہ ذرّہ کیا خودی سے تن کے جو صحرا نہ ہو جائے
وہ قطرہ کیا جو موجیں مار کر دریا نہ ہو جائے

اگر سوزِ دروں سے ہر بُنِ مُو شعلہ افشاں ہو
چراغِ طُور تیری شمع کا پروانہ ہو جائے

عطا ہو چشمِ بینا۔ لوحِ تقدیرِ جہاں پڑھ لے
جو تارِ اشک رنگیں سبحۂ صد دانہ ہو جائے

ہُما کا آشیاں گہ ہو نہالِ آرزو تیرا
جو سبزے کی طرح گلشن میں تُو بیگانہ ہو جائے

ادب گاہِ محبّت طُرفہ مکتب ہے زمانے میں
کوئی فرزانہ بن جائے، کوئی دیوانہ ہو جائے

یہ جانِ زندگی ہے، اے خدا بیمار دل میرا
کہیں اچھّا نہ ہو جائے، کہیں اچھا نہ ہو جائے

وہ آئے نزع میں، اے اشکِ حسرت لاج رکھ لینا
یہ میری زندگی کا راز ہے، رُسوا نہ ہو جائے

تغافل دیدہ دل کو حشر میں بھی یہی دھڑکا
کہ وعدہ آج کا بھی وعدۂ فردا نہ ہو جائے

بھلا یہ زندگی بھی زندگی ہے کوئی اے نشترؔ!
کہ جیتے جی کسی کی سرگزشت افسانہ ہو جائے

ابو نعیم نشترؔ جالندھری

تحدیدِ اسلحہ

بین الاقوامی سیاست اتنی پیچ دار اور الجھی ہوئی ہے کہ اس کو سمجھنا کام رکھتا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس بھول بھلیاں میں انسان گم ہو کر رہ جاتا ہے تحدیدِ اسلحہ کے متعلق آپ نے بیسیوں مرتبہ اخباروں میں پڑھا ہو گا مگر سچ سچ کہیئے کہ آپ نے اس کے متعلق کیا سمجھا ہے لیکن میں آپ کی عقل و دانش کا امتحان لینا نہیں چاہتا۔ میں نے اس کے متعلق جو کچھ سمجھا ہے وہ نہایت سادہ الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اس طور پر کہ بچے کو بھی غلط فہمی نہ ہو سکے + فرض کر لیجئے کہ آپ اور میں ذرا کم سمجھ والے واقع ہوئے ہیں میرے پاس تکیہ ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ تکیہ میں آپ کے سر پر دے ماروں آپ کے پاس ایک انڈہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ آپ اسے میرے سر پر پھوڑ دیں گویا تکیہ اور انڈہ ہمارے اسلحہ ہیں۔ امن قائم رکھنے کی خاطر ہم آپس میں سمجھوتا کرنے کے لیے تحدیدِ اسلحہ کی ایک مجلس منعقد کرتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے لئے ایک تکیہ رکھنے کے حقوق حاصل کریں گے اور میں ایک انڈہ رکھنے کا حق طلب کروں گا گویا ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کو برابر کا ضرر پہنچانے کا سامان ہو گا ہم دونوں میں سے کسی کو حق نہیں ہو گا کہ دوسرے کے مشورے کے بغیر اپنے ہتھیاروں میں اضافہ کر کے باہمی امن کو خطرے میں ڈالے اب کچھ دیر کے بعد میں آپ کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ آپ کے پاس قلم تراش ہے جو وقت پر مہلک ہتھیار ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر آپ میری توجہ اس امر کی طرف منعطف کراتے ہیں کہ میرے ملکیت میں ایک کلہاڑی ہے جس سے میں ایک ہی ضرب میں گردن اڑا سکتا ہوں اس پر ہمارے دلوں میں دفعتہً جذبۂ امن پسندی کروٹ لیتا ہے اور میں جھٹ سے ایک قلم تراش خرید لیتا ہوں اور آپ اولیں فرصت میں کلہاڑی لے آتے ہیں + اب حالات بین الاقوامی سیاسیات کی طرح ترقی پذیر ہو جاتے ہیں اور ایک روز میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ چونکہ میرے ہتھیاروں کے جواب میں آپ کے پاس بھی اسی قسم کے ہتھیار موجود ہیں۔ اس لئے مجھے بازار سے پستول خریدنے میں کوئی دیر نہ کرنی چاہیئے۔ بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے۔ جب میں پستول خرید کر لاتا ہوں تو آپ پستول کے ساتھ ساتھ ایک چمکیلی تلوار بھی لے آتے ہیں۔

اب فطری طور پر میں بھی تلوار خرید لیتا ہوں اور ساتھ ساتھ تحدیدِ اسلحہ کے جذبے کے ماتحت ایک مشین گن بھی گاڑی پر لدوا کر لے آتا ہوں۔ تو سمجھ لیجئے کہ اب امن و امان قائم ہونے میں کوئی دیر نہیں، آپ دوڑ کر بہترین اسلحہ ساز کے یہاں سے ایک عمدہ قسم کا تباہ کن ٹینک لے آتے ہیں، اور لگے ہاتھوں ایک بڑا سا بم بھی خرید لیتے ہیں۔ جس سے میرے گھر کی چھت بھک سے اڑائی جا سکتی ہے۔ خاکسار بھی آپ کی دیکھا دیکھی دو ایک گولے گھر میں ڈال لیتا ہے اور بطور حفظِ ماتقدم گیس بنانے والوں کو چند سلنڈر زہریلی گیس تیار کرنے کی فرمائش بھی کر ڈالتا ہے۔ اس گیس سے آپ کے بال بچوں کا رنگ پیلا پڑ سکتا ہے اور آپ کے چہرے پر سوکھے ہوئے بینگن کی طرح جھریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس پر آپ اس قسم کی گیس تلاش کر لیتے ہیں جو میرے سر، میری ٹانگوں اور میرے بازوؤں کو سرے سے غائب ہی کر دے پھر آپ احتیاطاً ایک بم بار طیارہ بھی اپنے گھر میں لے آتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم کچھ اس طرح "غیر مسلح" ہو جاتے ہیں کہ ہمارے درمیان جنگ کا خیال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑے دنوں کے اندر ہم ایک دوسرے کو بالکل فنا کر دیتے ہیں۔ مگر یہ تباہی اتفاقی ہو گی۔ اس کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیئے +

سعادت حسن منٹو

غالب اور حالی کے اشعار پر دو پُرلطف تضمینیں

مولوی محبوب علی وجد کاکوروی ایم اے

سُنا ہے جب سے کہ چوری کی اُن کو عادت ہے
ہمیں حفاظتِ ساماں کی سخت دقت ہے
نگاہداشت کی ہر وقت کس کو فرصت ہے
"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

مولوی محمد داؤد علیگ مرحوم

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں
پہلے یہ دیکھے وہ اُس کام کے ہے بھی شایاں
سُن کے لوگوں سے کہ وہ آئے تھے داؤد کے یاں
"اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھئے آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت"

مرسلۂ عبدالرشید راحل ہوشیارپوری (ماخوذ از بیاض راحل)

نغمۂ شوق

روشن تھی کبھی جس سے مری انجمنِ شوق
وہ آتش افسردہ ہے پھر شعلہ زنِ شوق!

بن جائے نہ تو بھی کہیں آئینۂ حیرت
حیراں نہ ہو گر لب پہ نہیں ہے سخنِ شوق!

غارت گرِ ایماں ہے ترا شیوۂ الطاف!
اندازِ تغافل ہے ترا راہزنِ شوق!

رنگین مرے عشق سے تیرا چمنِ حسن
شاداب ترے حسن سے میرا چمنِ شوق!

ہو جائے نہ دیوانہ کوئی رشک کے مارے
الجھا ترے دامن سے مرا پیرہنِ شوق!

فطرت نے کیا اس کو اسیرِ غمِ دنیا!
جس کو نہ گوارا ہوئے رنج و محنِ شوق!

بیگانہ وفا سے نظر آتا ہے زمانہ!
کیوں اٹھ گئی دنیا سے یہ رسمِ کہنِ شوق!

افسانۂ پارینہ ہوئی جرأتِ منصور!
پھر تازہ کرو قصۂ دار و رسنِ شوق!

مہر و مہ و انجم کو ملا نور جہاں سے
وہ جلوہ گہِ ناز ہے میرا وطنِ شوق!

حفیظ ہوشیارپوری
ایم۔ اے

ملکی شکوہ

(نئی "آزاد" شاعری کو دُور سے سلام کرتے ہوئے)

تونے مجھ کو کس لئے اس ملک میں پیدا کیا ؟
اے خدا !

شہر
میونسپل قہر !
گرد !
عورتیں اور مرد
زرد !
دل میں معدے میں جگر میں
ہلکا ہلکا میٹھا میٹھا
تیری الفت کا سا درد !

قسمت !
قدرت !
قوت !
کلفت !
کیا ہمارے واسطے ہی رہ گئے ہیں ان کے جور ؟
اے خدا ! تونے کیا ہے کیا کبھی اس پر بھی غور ؟
ہم تو ہیں تیرے غلام !
بے دام
ناکام
ہر وقت کرتے ہیں سلام !
حاکم کا ڈر
الحذر !
لب پہ اپنے صبح و شام

ایشور، اللہ، رام !
اور یوروپ میں تجھے
کیا مجال
پوچھے کوئی
جانے کوئی
مانے کوئی !
ان پہ مگر
شام و سحر
پھر بھی تو ہے مہرباں !
"رحم والا مہرباں" !
اے خدائے دو جہاں !

"منسٹر" ! (minister)
باخبر !
اور سیاسی آدمی
وہ نہیں جن کی کمی،
سب سے کرتے ہیں اپیل،
کہتے ہیں ہم ہیں اصیل
پر ہمارے "رائی وَل" (rival)
سر میں ہے ان کے خلل،
بہتری میں ملک کی ہم
سہتے ہیں کیا کلفت و غم،
ورنہ ہم کو کیا پڑی
منہمک کیوں ہر گھڑی ؟

واہ پبلک اسپرٹ یہ اے مرے ہندوستان !
الاماں اے الاماں اے الاماں اے الاماں !

تو نے دیکھا مجھ کو یارب! کس جگہ پیدا کیا ؟
سب سے چھڑوا کر بس اپنے آپ پر شیدا کیا !
زور و قوت سے طلاق !
زیست کی خوشیوں سے عاق !
سازشیں بے قاعدہ !
کوششیں بے فائدہ !
اور ہماری زندگی
ہے اگر تو ہے یہی :-
جھوٹ،
موٹ،
سوٹ،
بوٹ !
جس میں طاقت ہے وہ ٹھگ،
جو ہے بیچارہ وہ سگ !
عقل و دانش کو سلام،
اور کوئی نہ کوئی
سودائے خام !

تقدیر !
پیر !
وزیر !
ان سے خائف ہر گھڑی
مفلس ہو کوئی یا امیر !
ہیضہ، طاعون اور بخار
گنڈے، تعویذ، اشتہار !
انجمنیں !
سمیلنیں !
شاعری اور قافیے
مست جن سے بے پئے !
یہ ہیں مصروفیتیں،
نیک ہیں یوں نیتیں !

صحت !
راحت !
دولت !
صولت !
سب سے رخصت مل گئی
ہم کو فرصت مل گئی !
آہیں بھریں
دکھ سے مریں
آنسو بہائیں
یا غل مچائیں !
اے خدا !
اے وہ جلدی میں ملا مجھ کو نہ جس کا قافیہ !
کیوں کریں پر کیوں کریں ہم بات کوئی کام کی
لاج رکھنی ہے ہمیں تو صرف تیرے نام کی !

بشیر احمد

انجمن اردو پنجاب کے ادبی جلسہ منعقدہ ۲۱ نومبر ۱۹۳۶ء میں پڑھی گئی۔

محفل ادب

افسردہ صبح

یا سازِ سحر ہے ویسا ہی، اور روح مری بیدار نہیں
یا آج صباحِ شیریں کے جنبش میں لب گفتار نہیں،

یا میری بصیرت ہی کا افق تاریک ہے گہرے بادل سے
یا آج سحابِ غمگیں ہی چھٹنے کے لئے تیار نہیں

یا میرے ہی دل میں ساکن ہیں احساسِ تجلی کی موجیں
یا آج ضمیرِ قدرت ہی آئینۂ صد انوار نہیں

یا خود ہی مری جودت کی گرہ کھلنے پہ نہیں ہے آمادہ
یا آج چمن کا اک غنچہ کھلنے کے لئے تیار نہیں

یا حسنِ ازل کا پرتو ہی افسردہ ہے میرے سینے میں!
یا آج سحر کے رخ پر ہی طغیانِ جمالِ یار نہیں

یا کان ہی میرے عاری ہیں ادراک سرودِ پنہاں سے
یا آج عروسِ قدرت کی پازیب میں وہ جھنکار نہیں

جوش "کلیم"

مشرقی مہمان نوازی

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم نے مجھ کو دو واقعات، اپنے سفر یورپ کے سنائے تھے کہ ایک دفعہ وہ کسی انگریز کے مہمان تھے اور میز پر کھانا اتنی مقدار میں موجود تھا۔ کہ کئی فالتو آدمی بھی کھا سکتے تھے۔ اسی اثنار میں ایک غریب انگریز وہاں آیا اور اس نے صاحب خانہ سے کہا کہ وہ تین وقت سے بھوکا ہے صاحب خانہ نے جواب دیا تم فلاں خیرات خانہ میں جا سکتے ہو اور جب وہ چلا گیا تو صاحب خانہ نے حکیم صاحب سے کہا میں نہیں جانتا کہ یہ شخص بھوکا تھا۔ کیونکہ اکثر بدچلن آدمی فرضی باتیں بنایا کرتے ہیں ؎

اس واقعہ کے بعد حکیم صاحب ترکوں کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں گئے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے شام کو پیدل سیر کرنے بازار میں جا رہے تھے کہ ان کو لب سڑک ایک باغ دکھائی دیا حکیم صاحب نے اس کو عام باغ سمجھا اور اس کے اندر چلے گئے اس باغ میں کسی ترک پاشا کی پردہ نشین خانم رہتی تھیں (یہ ذکر ۱۹۱۱ء کا ہے جب کہ ترک عورتیں پردہ کرتی تھیں) ایک نوکر عورت نے حکیم صاحب کو دیکھا تو چیخ کر کہا تم کون ہو جو پردہ باغ میں آ گئے حکیم صاحب نے جواب دیا میں مہمان ہوں، مہمان کا لفظ سن کر عورت نے کہا مہمان میرے سر پر اور آنکھوں پر۔ تم سامنے کے کمرہ میں بیٹھ جاؤ، پاشا باہر گئے ہیں خانم پردہ میں ہیں میں ابھی ناشتہ لاتی ہوں حکیم صاحب نے کہا میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوں مجھے ناشتہ کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت نے کہا ایک مسلمان ترک کے گھر میں مہمان آئے اور کچھ کھائے پئے بغیر چلا جائے یہ ناممکن ہے۔ اور ترک کی سب سے بڑی ذلت اور توہین ہے حکیم صاحب یہ سن کر کمرہ میں بیٹھ گئے وہ عورت پہلے تازہ اخبار دے گئی اور پھر ایک خوان لائی جس میں

میوہ تھا اور مٹھائی تھی اور چار تھی اور خانم کی طرف سے کہا کہ میں مہمان کا شکریہ ادا کرتی ہوں جو میرے گھر آیا افسوس ہے پاشا موجود نہیں ہیں ورنہ وہ مہمان سے مل کر بہت خوش ہوتے جب وہ آئیں گے تو میں ان کو مبارکباد دوں گی کہ ایک ہندوستانی مسلمان ان کے گھر میں مہمان آیا تھا

ان دونوں واقعات سے مشرق و مغرب اور ایشیا اور یورپ کی مہمان داری کا فرق ظاہر ہو سکتا ہے ؛

اسی ۱۹۱۱ء میں میرا سفر بھی اسلامی ممالک میں ہوا تھا میں دمشق کے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گیا تو وہاں میز پر کئی ترک اور عرب پہلے سے کھانا کھا رہے تھے میں السلام علیکم کہہ کر میز کے پاس بیٹھا اور ہوٹل والے نے مجھے کھانا کھلایا جو ترک اور عرب کھا رہے تھے ، وہ السلام علیکم کہہ کر چلے گئے اور میں نے ہوٹل والے سے اپنا بل مانگا تو اس نے کہا کہ تمہارے کھانے کی قیمت ترک دے گئے ہیں ۔ میں نے کہا کیوں ؟ وہ کیوں دے گئے میری تو ان سے واقفیت بھی نہیں تھی ۔ نہ میں ان کو جانتا تھا ۔ نہ وہ مجھ کو جانتے تھے ؛

ہوٹل والے نے کہا وہ مسلمان تھے اور آپ بھی مسلمان ہیں وہ پہلے سے بیٹھے تھے اور آپ بعد میں آئے تھے اس لئے ان پر آپ کی مہمانداری لازم ہو گئی تھی اور مہمان سے واقفیت کچھ ضروری چیز نہیں ہوتی انہوں نے آپ کے کھانے کی قیمت دے کر آپ پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنا مسلمان ہونا ثابت کیا ہے ؛

(حسن نظامی)

(نظام جوبلی میگزین)

تبلیغ

(۱)

کملا دیہاتی برہمن کی لڑکی گاؤں میں پیدا ہوئی جیسے خود رو بیلیں پروان چڑھتی ہیں ، شہری ہنگاموں سے دور پالی پوسی گئی جب ہی تو سات سال کی ہونے پر بھی بھولے بھالے بچوں کی طرح معصوم صفت رہی ؛

اسے بناؤ سنگار کا احساس نہ تھا یونہی اُجلی اُجلی ساڑی پہنے میدہ شہاب رنگ سے آنکھوں میں کھبی جاتی تھی ، ایسی پیاری پیاری ننھی ننھی سی گڑیا کو تو شیشے کے گلوب میں رکھے کہ کہیں نرم گرم ہوا نہ چھو جائے ؛

دیہاتی بول چال اور کچھ تھوڑی بہت ہندی نوشت و خواند کے سوائے وہ اُردو کے چٹخاروں سے ناآشنا تھی اس یگانگی کے باوجود میں جو چند بار ادھر گیا تو مجھ سے بے حد مانوس ہو گئی مجھے دیکھ کر آپے میں نہ رہتی نہالوں نہال ہو جاتی گویا کھوئی دولت پائی ؛

اس کے بڑے بوڑھے کہتے تھے صاحب یہ آپ سے بہت ہل گئی ہے گھر کا تنکا ادھر سے اُدھر نہیں کرتی اپنی ماں کو دق کیا کرتی ہے جب شرارت سے باز نہیں آتی اور دھمکاتے ہیں اچھا ٹھہر جا آنے دے ذرا میر صاحب کو " تو کچھ مجبور سی رہ جاتی ہے ۔

اور میں نے دیکھا کہ واقعی وہ میرے کاموں میں دوڑی دوڑی پھرتی تھی کیا مجال جو کہنا ٹال دے بچپن کے تقاضہ سے مجھے کھلونا بنا رکھا تھا ، اپنا سمجھ کر وہ وہ شوخیاں ایسے ایسے تماشے کرتی تھی ، کہ کیا کہوں ؛

(۲)

ایک بار میں لیٹا ہوا تھا ، کہنے لگی :-

ہاتھ پاؤں دبادوں ؟

"نہیں"، میں نے جواب دیا۔

اس کا چچا پنکھا بڑھا کر بولا:۔

"لے ذرا ہوا کر میاں پسینے میں نہا رہے ہیں۔!

بس اس نے اس قدر زور زور سے پنکھا جھلنا شروع کیا، چہرہ لال بھبوکا ہوگیا۔ باری باری ہاتھ ادلے بدلے تھک گئی تو سرہانے کھڑی ہوکر آہستہ آہستہ ہوا کرنے لگی، چند لمحے گئے ہونگے آنکھیں بند کیے کر سو بھی جو شرارت، میرے پیٹ پر پنکھا رکھ دیا، جونہی میں اٹھانے کو ہوا، فوراً اچک لیا۔ اور جھوم جھوم کر جھلنے لگی۔

اب دہر آتی ہے ادہر جاتی ہے کبھی کودتی ہے کبھی ٹھٹھے لگاتی ہے ایک دفعہ ذرا اچی جو نظر اسکی، چپکے سے میں نے پنکھا ہتیا لیا۔ اوہ کیا بے اختیار مجھ پر ٹوٹی ہے، مگر وہ تو دوسرے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا سخت جھنجھلائی، بڑی تنتنائی، خوب چیخی، رہ رہ کے جھپٹی، اچھلی، کودی کامیاب نہ ہوسکی۔

آخر جب کچھ بس نہ چلا۔ تو گھبرا کر کہتی کیا ہے:۔

"تمن ٹھاکر جو کی سوں ہے، موہے دے دیو!

(تمہیں کرشن جی کی قسم ہے مجھے دے دو)

اس کا چچا میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا:۔

"کملا! جے مسلمان ہیں، جن کیں ٹھاکر جو کی اپاسنا ناہیں کرت!!"

(کملا یہ مسلمان ہیں ان کے یہاں کرشن کی پوجا نہیں کرتے) "ایں"

لڑکی ٹکر ٹکر میرا منہ تکنے لگی ......

"اللہ اکبر! وہ معصوم انکھڑیاں، بت پرستی کی تعلیم دے رہی تھیں"

مرزا فہیم بیگ چغتائی "شاہجہاں"

غالب کی عالی ظرفی

منشی شیو نرائن نے ایک رسالہ معیار الشعراء کے نام سے نکالا تھا جس میں مختلف شعراء کی غزلیں چھپتی تھیں امیر مینائی مرحوم و مغفور نے بھی اپنا کلام بغرض اشاعت بھیجا تھا لیکن منشی شیو نرائن نے معیار الشعراء میں ایک عبارت شایع کردی کہ جب تک ان کا پورا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ان کا کلام چھاپا نہیں جائے گا غالب نے معیار الشعراء میں یہ عبارت دیکھی تو فوراً منشی شیو نرائن کو لکھا کہ":۔

"میرے دوست ہیں۔ امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو لیعنے غزلیں غالب نے تمہارے پاس بھیجیں اور اس کے (غالب کے) لکھنے سے ان کا (امیر مرحوم کا) نام اور ان کا حال معلوم ہوا۔ اس کو معیار الشعراء میں چھاپ کر دو ورقہ یا چار ورقہ رامپور ان کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر لکھو کہ "در رامپور۔ بردر دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد برسد۔ اور مجھ کو اطلاع دو۔"

شعراء معاصرانہ رقابتوں کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں بالخصوص جب ان کا دائرہ تمتع مالی ایک ہو تو ایک دوسرے کی شہرت و ناموری کے لئے کوششوں کی توقع ہی نہیں رکھنی چاہیئے لیکن غالب کی ذات ایسی رقابتوں سے بالکل بالاتر تھی اگرچہ امیر مرحوم بھی غالب کی طرح سرکار رامپور کے متوسل تھے لیکن غالب کو ان کی تعریف و تحسین میں تطعاً تامل نہیں ہوا۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں، غالب کے رقعات میں دوستوں اور متوسلوں کی امداد کی مثالیں بہت ملتی ہیں یوسف علی خاں عزیز ان کے ایک مخلص شاگرد تھے متعدد خطوط میں ان کے محاسن بیان کئے ہیں خود بھی باوجود قلت مداخل ان کی امداد میں دریغ نہیں فرماتے تھے۔ (حسن نظامی)، "نظام جوبلی میگزین"

میر اور نظیر کا ایک ایک ہم مضمون قطعہ

(ایک تقابلی مطالعہ)

نظیر

ایک دن اک استخواں پر جا پڑا میرا جو پاؤں — کیا کہوں اس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی — اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
دست و پا، زانو، سر و گردن، شکم، پشت و کمر — دیکھنے کو آنکھ، اور سننے کی خاطر کان تھے
ابرو و بینی، جبیں، نقش و نگار و خال و خط — لعل و مروارید سے بہتر لب و دندان تھے
رات کے سونے کو کیا کیا نرم و نازک تھے پلنگ — دن کو خاطر بیٹھنے کی تخت اور ایوان تھے
ایک ہی جھٹکا اجل نے آن کر ایسا دیا — پھر نہ تو ہم تھے نہ وہ سب عیش کے سامان تھے
ایسی بے رحمی سے مت رکھ پاؤں ہم پر اے نظیر! — او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

میر

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سر پُر غرور تھا

"دونوں شاعروں نے ایک ہی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے، اور ایک ہی اثر لیا ہے۔ مگر جو زور اور جتنا اثر میر نے دو شعروں میں بھر دیا ہے اس کا عشر عشیر بھی نظیر کے سات شعروں میں نہ سما سکا۔ اس کے اور اسباب بھی ہوں گے، لیکن خاص سبب یہی ہے کہ میر نے اختصار سے کام لیا اور نظیر نے بے کار طول دیا۔ نظیر بھی اگر اختصار پر نظر رکھتے تو اُن کے قطعے میں بھی اثر کا ایک عالم ہوتا، اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ اگر ان کے قطعے سے شروع کے دو شعر اور آخر کا ایک شعر لے لیا جائے اور درمیان کے چار شعر نکال دیئے جائیں تو یہ قطعہ بن جاتا ہے۔

ایک دن اک استخواں پر جا پڑا میرا جو پاؤں — کیا کہوں اس وقت میرے دل میں کیا کیا دھیان تھے
پاؤں پڑتے ہی غرض اس استخواں نے آہ کی — اور کہا ظالم کبھی ہم بھی تو رکھتے جان تھے
ایسی بے رحمی سے مت رکھ پاؤں ہم پر اے نظیر — او میاں ہم بھی کبھی تیری طرح انسان تھے

اب اس مختصر قطعے کا ان کے اصل قطعہ سے مقابلہ کیجیئے اور دیکھیئے کہ اختصار سے کلام میں اثر کیونکر پیدا ہو جاتا ہے۔"

"نگار"

مطبوعات

"عکسی قرآن مجید":۔ انجمن حمایت اسلام لاہور نے چھ سال کی لگاتار محنت کے بعد زر کثیر صرف کر کے کلام مجید کا نہایت خوبصورت اور صحیح عکسی نسخہ شائع کیا ہے سائز $\frac{۲۹ × ۴۰}{۱۶}$ قیمت قسم خاص ۲۵ روپے، قسم اول ۵ روپے اور قسم دوم تین روپے، مزید تفصیلات اور نمونے کے ۱۶ صفحات کا پمفلٹ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور سے مفت طلب فرمایئے ؛

تاریخ اسلام:۔ "ملک دین محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور" نے مولانا عبدالرحمٰن شوق امرتسری کی مشہور کتاب "تاریخ اسلام" کی پانچوں جلدیں یکجا مجلد شائع کی ہیں۔ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ ابتدا سے لے کر ۱۳۴۴ ہجری تک کے اسلامی دنیا کے حالات عام فہم پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں ہزار صفحے کی مجلد کتاب کے لئے تین روپے بارہ آنے بہت کم قیمت ہے

"ہندوستان اور ملیت": مصنفہ "ایک پنجابی" مطبوعہ گیلانی پریس۔ قیمت مجلد: دو روپے آٹھ آنے غیر مجلد دو روپے، ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور، اس کتاب میں ہندوستان کے سیاسی، مذہبی، اقتصادی، اور معاشرتی حالات پر مفصل بحث کی گئی ہے شروع میں سر فضل حسین مرحوم کی تصویر ہے، اور کتاب کو انہیں کے نام سے معنون کیا گیا ہے ؛

"سلامبو":۔ فرانس کے مشہور انشا پرداز گستیو فلابیر کا شہ کار ہے۔ جسے مولانا عنایت اللہ صاحب دہلوی نے اردو میں ترجمہ کر کے دو حصوں میں شائع کیا ہے، کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ، دونوں حصوں کی قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ: "ساقی بک ڈپو"

"عجائبات سائنس" از ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل سکول لاہور۔ سائنس کے جدید نظریات کو نہایت آسان اردو میں پیش کیا ہے، درسی کتابوں کے سائز کے ۱۱۶ صفحات ہیں۔ مؤلف سے منگایئے ؛

"تمدن عتیق": مصنفہ ابوظفر عبدالواحد، و محمد عطاء الرحمٰن۔ اساتذہ سٹی کالج حیدرآباد دکن قیمت با تصویر تین روپے، بلا تصویر دو روپے، آغاز حیات، انسانی تمدن کے ارتقا اور مختلف اقوام کی تہذیبوں کے نشوونما کی مختصر تاریخ ہے۔ مصنف سے منگایئے ؛

طلسمات:۔ پروفیسر سید عابد علی صاحب عابد ایم اے ایل ایل بی لکچرار دیال سنگھ کالج لاہور کے مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ ہاشمی بکڈپو ریلوے روڈ لاہور نے اس نام سے شائع کیا ہے۔ جو ۲۲۴ صفحات اور ۱۵ طبعزاد افسانوں پر مشتمل ہے۔ شروع میں پروفیسر ڈاکٹر بھوپال سنگھ صاحب ایم اے ڈی لٹ، صدر شعبۂ ادبیات انگریزی دیال سنگھ کالج لاہور کا دیباچہ بھی شامل ہے جس میں مختصر افسانہ نویسی کے آغاز اور ارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے ہندوستان میں طبعزاد افسانوں کا فقدان ہے۔ اس لئے عابد صاحب کو اس کتاب کی اشاعت پر ہم مبارکباد دیتے ہیں۔ عابد صاحب کا ہر افسانہ نہایت دلچسپ ہے۔ مہارت فن کے اعتبار سے عابد صاحب کے معاصرین میں کم ہی ان کے ہم پایہ قرار دیئے جا سکتے ہیں وہ ایک حقیقی افسانہ نویس ہیں۔ کتاب مجلد ہے، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ ہاشمی بکڈپو ریلوے روڈ لاہور سے طلب کیجئے ؛

"سحر بنگال" :۔ محترمہ طاہرہ دیوی شیرازی کے چودہ دلکش مطبوعہ افسانوں کا مجموعہ ساقی بک ڈپو دہلی نے شائع کیا ہے، کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ، قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ؛

"تماشا پہ تماشا" :۔ چھوٹا سا افسانہ ہے جو شاہجہان بک ایجنسی دہلی نے جیبی تقطیع پر شائع کیا ہے مصنف حضرت ناکارہ حیدرآبادی ہیں ۔ قیمت چار آنے ؛

"گہوارہ تبسم" ۔ قاضی عباس حسین ظریف دہلوی کی مزاحیہ غزلوں کا مجموعہ ہے چھوٹی تقطیع چار آنے میں مصنف سے کوچۂ نواب مرزا دہلی، کے پتہ سے مل سکتی ہے ؛

"دل صد پارہ" ۔ جناب محمد عباس طالب صفوی کے سو شعروں کا مجموعہ ہے۔ انتخاب اچھا اور دلچسپ ہے مصنف سے قصبہ شمس آباد ضلع فتح گڑھ (یو، پی) سے منگائیے ۔ قیمت ۴ ؍ ؛

"بلاغ" :۔ امرتسر کا مذہبی رسالہ ہے۔ جو چند سال سے باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اس کا مقصد خالص قرآنی تعلیمات کی تشریح اور نشر و اشاعت ہے مذہب میں دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے ضرور پڑھیں۔ سالانہ چندہ تین روپے، نمونہ کا پرچہ چار آنے،
منیجر "بلاغ" امرتسر سے طلب کیجئے ؛

"شیرازہ" :۔ ایک ادبی و مزاحیہ ہفت روزہ ہے۔ جو حضرت سندباد جہازی اور مسٹر محمود افضل کی ادارت میں لاہور سے جاری ہوا ہے دو پرچے نکل چکے ہیں اور ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ "شیرازہ" ذاتیات اور سیاسی جھگڑوں سے بالکل پاک ہے۔ مزاحیہ نظموں اور ادبی مضامین کا معیار بلند ہے، تقطیع فلسکیپ، حجم ۳۲ صفحے، قیمت سالانہ تین روپے، فی پرچہ ایک آنہ،
ملنے کا پتہ: منیجر "شیرازہ" برکت علی سٹریٹ، ادل محمد روڈ لاہور ؛

"مصوّر" :۔ ہفتہ وار اخبار ہے۔ جو "ہمایوں" کے مضمون نگار جناب سعادت حسن صاحب منٹو کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہوتا ہے بیشتر حصہ فلمی کوائف کے لئے وقف ہے۔ لیکن ادبی مضامین اور نظمیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ فلمی اخبارات و رسائل میں مصوّر کا پایہ بہت بلند ہے۔ سالانہ چندہ: پانچ روپے۔ فی پرچہ چھ پیسے ؛

"ہومیو ڈاکٹر" :۔ ڈاکٹر محمد اسمٰعیل اور ڈاکٹر غازی صاحب کی ادارت میں ماڈل ٹاؤن لاہور سے ہر مہینے شائع ہوتا ہے، ہومیو پیتھک کے ڈاکٹروں اور اس طرز علاج کے دلدادہ مریضوں کے لئے اس کے مضامین بہت مفید ہیں۔ سالانہ چندہ، دو روپے قیمت فی پرچہ ۳؍

"بہار وطن" :۔ یہ ماہوار رسالہ پنڈت برجموہن کیفی دہلوی کی سرپرستی اور پنڈت سیلا رام وفا و جناب تاجور سامری کی ادارت میں لائل پور سے جاری ہوا ہے۔ پہلا پرچہ پیش نظر ہے۔ اگر مضامین نظم و نثر کے انتخاب اور ترتیب کا کام سلیقہ سے کیا گیا تو امید ہے۔ کہ جلد ترقی کرے گا۔ سالانہ چندہ دو روپے۔ طلبہ سے ڈیڑھ روپیہ۔ فی پرچہ دو آنے ؛

غالب نامہ . . . . . . از مسٹر محمد اکرام ایم اے آئی سی ایس } مرزا غالب کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور بہت سی لکھی جائیں گی لیکن "غالب نامہ" کو دیکھ کر ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں۔ کہ تنقید غالب کے موضوع پر یہ کتاب ایک تاریخی انکشاف کی حیثیت رکھے گی، اس صدی کے آغاز بلکہ گذشتہ صدی کے ربع آخر سے پنجاب کو مرزا غالب کے ساتھ خاص عقیدت اور وابستگی رہی ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ غالب پر اس وقت تک سب سے اچھی اور جامع کتاب پنجاب کے ایک ادیب کی محنت اور کاوش سے شایع ہو رہی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے ایک پروفیسر سید عبداللطیف صاحب نے ۱۹۲۸ء میں مرزا غالب کے اردو کلام کو بہ ترتیب ردیف نہیں بلکہ ترتیب سن تصنیف شایع کرنے کا اعلان کیا تھا، اور پرستاران غالب اس کی اشاعت کے لئے چشم براہ تھے۔ مگر یہ وعدہ آج تک پورا نہیں ہوا۔ مقام مسرت ہے کہ مسٹر ایس، ایم، اکرام نے برسوں کی محنت اور تلاش کے بعد مرزا غالب کے تمام اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب بہ اعتبار سن تصنیف ترتیب سے شایع کیا ہے، اس کتاب کی تیاری میں انہوں نے انگلستان اور ہندوستان کے بہت سے کتب خانوں مثلاً انڈیا آفس لائبریری، برٹش میوزیم لائبریری، کتب خانہ رام پور وغیرہ سے مرزا کے کلام کے ابتدائی قلمی اور مطبوعہ نسخے تلاش کئے ہیں اور ان کی مدد سے مرزا کے کلام کو ایسی ترتیب سے شایع کیا ہے کہ شاعر کے تخیل کا ارتقا نہایت واضح طور پر نظر کے سامنے آجاتا ہے، مسٹر اکرام نے فقط مروجہ دیوان کا انتخاب ہی شایع نہیں کیا بلکہ غیر متداول اور غیر مطبوعہ اردو کلام اور ضخیم فارسی کلیات کا باذاق انتخاب بھی مرتب کیا ہے، مرزا کے اردو دیوان کے کئی اچھے ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں لیکن فارسی کلیات ابھی تک سستے اور گھٹیا کاغذ پر چھپتا رہا ہے، "غالب نامہ" کی اشاعت سے یہ شکایت بھی دُور ہو گئی ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اب مرزا کا فارسی کلام بھی وہ مقبولیت حاصل کرے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

غالب کے کلام کی یہ تاریخی تدوین اُردو تنقید میں بجائے خود ایک کارنامے کی حیثیت سے یادگار رہے گی لیکن "غالب نامہ" کی دو اور خصوصیتیں ایسی ہیں جو اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتی ہیں۔ کتاب کا پہلا حصہ مرزا کی مفصل اور مربوط سوانح عمری پر مشتمل ہے جو بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد لکھی گئی ہے، کتاب کے دوسرے حصے میں مرزا کے کلام اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے۔ یہ بھی اُردو تنقید میں ایک نئی چیز ہے، اس میں فاضل مصنف نے مرزا کا تعلق ان کے ماحول اور ان کے عہد کے ساتھ بڑی خوبی اور کامیابی سے نمایاں کیا ہے۔

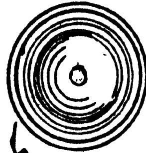
کتاب باتصویر ہے، پہلے تو میرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ تصویر کا عکس ہے جو غالب کی زندگی میں تیار ہوئی تھی۔ پھر مرزا کی آخری دستخطی تحریر کا عکس ہے۔ یہ تحریر مرزا نے اپنی وفات سے چند مہینے پہلے لکھی تھی جب ان کے ہوش و حواس بھی درست نہیں تھے۔ اس کے علاوہ دو تصویریں اور ہیں۔ کتاب کا حجم ۴۲۴ صفحات، قیمت مجلد تین روپے، غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے منیجر مسلم گجرات پریس، سورت، احاطہ بمبئی سے مل سکتی ہے۔

تصاویر یہ سالگرہ نمبر } اس پرچے کی تمام تصاویر عہد حاضر کے ترقی یافتہ فن فوٹوگرافی کے نادر نمونے ہیں یہ مصوروں کا کام نہیں فوٹوگرافروں کا کمال ہے۔

جدید فہرست کارخانہ مفت طلب فرمائیے

اعلیٰ طبقہ کی خواتین سر میں لگانے کیلئے اس کارخانہ کا تیار کردہ تیل استعمال کرتی ہیں

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ



طبقہ نسواں میں اس کارخانہ کا عطر عروس نہایت مقبول ہو رہا ہے

یہ کارخانہ سنہ ۱۸۳۹ء سے نیک نامی کے ساتھ جاری ہے

بعدالت جناب سید خورشید حسن صاحب بہادر سول جج اول بہرائچ مقام بہرائچ

مقدمہ نمبر ۲۱ سنہ ۱۹۳۶ء متفرقات معمولی

(۱) دوارکا پرشاد۔ بالغ

(۲) رام سپل } نابالغان بولایت دوارکا پسران سنت دین۔ اقوام بھٹیار۔ ساکنان بھگنا بازار۔ پرگنہ بھنگا ضلع بہرائچ

(۳) شیام لال } برادر حقیقی

فریق ثانیان بنام

سردار گیان سنگھ ولد سردار یار سنگھ قوم سکھ ساکن رسول پور۔ پرگنہ بھنگا۔ تحصیل و ضلع بہرائچ

سردار گیان سنگھ ولد سردار یار سنگھ قوم سکھ ساکن رسول پور۔ پرگنہ بھنگا۔ تحصیل و ضلع بہرائچ

ہرگاہ مسمی دوارکا پرشاد وغیرہ نے درخواست حسب دفعہ آرڈر ۲۱ قاعدہ ۱۶ ضابطہ دیوانی باہمی کام وارثان بجائے سنت دین متوفی ڈگریدار لہذا تم کو اطلاع دیجاتی ہے کہ تم اصالتاً یا معرفت کسی وکیل کے جو حالات مقدمہ سے بخوبی واقف ہو بوقت دس ۱۰ بجے بتاریخ ۱۳ (تیرہ) جنوری سنہ ۱۹۳۷ء اس عدالت میں حاضر ہوکر درخواست کے خلاف وجہ دکھاؤ۔ اگر ایسا نہ کروگے تو درخواست مذکور تمہاری غیر حاضری میں بتاریخ ۱۳ (تیرہ) جنوری سنہ ۱۹۳۷ء سماعت کی جائے گی :

بتاریخ ۱۷ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا

(دستخط حاکم) (مہر عدالت)



داستان

دنیا کی سب سے رنگین کتاب افروڈایٹ کا ترجمہ

از عابد علی عابد۔ ایم اے۔ ایل ایل بی

مصر پُراسرار، رنگین، حسن و عشق کی سرزمین، اور قلوپطرہ کا عہد زرین

داستان

اس عہد کی ایک حسن فروش کسبی زرینہ کی رومانوی لیکن مہیب زندگی کا نقشہ ہے

بہ یک وقت تلخ و شیریں، زہر و شہد، سوز و ساز

آپ جانتے ہیں زرینہ نے کس کو چاہا؟

ملکہ مصر کے محبوب کو، اپنے وقت کے سب سے بڑے سنگ تراش کو،

جب یہ دو ستارے زرینہ اور ملکہ مصر ٹکرائے ہوں گے۔ تو کیا ہوا ہو گا؟

ازل سے لے کے ابد تک یہ داستان جاری ہے،

ایک مرد اور دو عورتیں یا ایک عورت اور دو مرد،

اس کشمکش کا مہیب اور ہولناک انجام

خاکستر محبت کی چنگاریاں، جہنم رقابت کے شعلے،

داستان کے آتشیں الفاظ میں کھیلتے ہوئے دیکھیئے

منیجر ہاشمی بک ڈپو ریلوے روڈ۔ لاہور

سید عبداللطیف بخاری پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں" المنظر ۲۳۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔